عشاق کے قافلے

16

بابو

عبدالکریم شورش

(1911.........14دسمبر1986)

شاہ محمد مری

جملہ حقوق بحقِ سنگت اکیڈمی محفوظ ہیں

ضابطہ:

نام کتاب	....	بابوعبدالکریم شورش
مصنف	....	شاہ محمد مری
موضوع	....	سوانح
پہلی اشاعت	....	2011
دوسری اشاعت	....	2017
تعداد	....	1000
قیمت	....	200روپے
پبلشر	....	سنگت اکیڈمی
فون نمبر	....	03003829300

ملنے کا پتہ:

سنگت اکیڈمی

206،مری لیب،فاطمہ جناح روڈ،کوئٹہ۔

فون:2843358-81-92+

email: books@sangatacademy.net

Web: www.sangatacademy.net

انتساب

اُس وقار کے نام
جس کے ساتھ بابو عبدالکریم شورش
انقلاب دشمنوں کی توھین کا سامنا کرتے رہے!

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

-فیضؔ

فہرست

پیش لفظ	8
جیسا میں نے اسے دیکھا	12
حسب نسب	20
بپتسمہ سیاست میں	21
ملک عبدالرحیم خواجہ خیل	23
قاضی داد محمد	29
دوسری عالمی جنگ اور بابو	37
اخلاقی جرأت	48
''بھوک ہڑتال نہیں، لباس ہڑتال''	51
امن کانفرنس	53
دستخطی مہم اور گرفتاری	55
صحافی بابو	57

سامراج دشمن بابو	71
شاعری	75
شورش سے امن	77
جوتوں کی دکان	80
نوکیں دور: جہازی سائز سے کارڈ تک	81
بابو شہید ہوئے	135
ہزار گنجی میں کچی قبر اور اس کا پس منظر	138
عقیدت کے پھول	141

پیش لفظ

بلوچوں کی اپنے مادرِ وطن سے محبت نہ زبان سے بیان کی جاسکتی ہے نہ بیان میں اُس کا احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ بلوچستان کیلئے ہزاروں لوگوں نے شعوری طور پر اپنی ذات کی نفی کی اور سیکڑوں لوگوں نے اپنی شریانوں کی شاہراہوں کے ذریعے بلوچستان کی سیر کروائی۔ بابو ایک ایسے محبِ وطن راہنما تھے جس میں اپنی مخصوص خصوصیات تھیں۔انہوں نے اپنی ذات کی نفی کر دی، مگر اِس نفی کی نفی یوں ہوگئی کہ کچھ لوگ بلوچستان کو دیکھتے ہی اس لئے ہیں کہ اس میں بابو رہتا تھا۔

بابو عبدالکریم اُن لوگوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے لیٹین شریف پر دستخط کر کے حلف لے کر خود کو تو لنگ ولاش کر کے قبر کے حوالے کر دیا مگر حلف 'لفظ'، اور حرف کی شان وسلامتی پر آنچ آنے نہ دی۔ معلوم نہیں کہ ہر بابو کا پس منظر بد بخت ہے یا خوش بخت مگر یہ حقیقت ضرور ہے کہ ہمارا یہ پس منظر بدلتا ہی نہیں ہے۔چلتن کی قحط سالی جوں کی توں ہے۔ مستنگ کی پسماندگی اپنی جگہ سے ایک قدم نہ سرکی، بلوچ کی برادر کشی دن دگنی اور رات چوگنی چوکڑیاں بھرتی ترقی کرتی جاتی ہے، بلوچستان کی قومی محکومی عمیق تر اور تاریک تر ہوتی جاتی ہے، اور نجات کی صدا باغی سے باغی تر ہوتی جاتی ہے.........نوری نصیر خان وشادی ہاں، دوداو دلیل، خیر بخش وزیر، یوسف کرد وطن کی آزادی کی جدوجہد میں جسم کے بال کانٹے بنے، مگر بنا کچھ بھی نہیں، غوث بخش وگل خان کلی کیمپ کے عہد

کے ترجمان بنے، مٹی کے تقدس کی خاطر مٹی کے مکیں ہو کر آسمان کے درخشاں تارے بنے کچھ نہ بنا، آزات و پناہ مست آوازیں اور دھیمی تحریریں بناتے رہے کچھ نہ بنا۔ مری اور بگٹی قبائل میں اکیسویں صدی تک شاہوں شہزادوں کی شہادتوں نے عمر کی کمی بیشی کا فرق کرنا چھوڑ دیا مگر بلوچستان کے ماتھے کا لکھا نہ بدلا...... بلوچستان کی تقدیر کس قدر گہری اور کھرچ کھرچ کر لکھی لکھنے والے نے...........مگر انسان ہے کہ ناخنوں سے اسے بدلنے کا عزم کیے ہوئے ہے، دَم نکلنے والی ضربیں کھا کر بلوچستان اور سوشلزم جپتا رہتا ہے، برباد ہو کر بادِنسیم میں بدلتا جاتا ہے، ہستی سے نیست ہو جاتا ہے مگر قبر سے امید کی کرنیں بکھیرتا جاتا ہے .... بھلا انسانی عزم کے سامنے بھی کوئی ٹکا ہے؟۔

بابو اُس زمانے میں انسانی سربلندی کا جھنڈا بلند کرتا ہے جب ابھی چاروں طرف سناٹا ہے، انگریز نے ہر بلند سر کو بونا بنا دیا ہے، خودداری ووقار دربار میں رہن رکھ دیے گئے ہیں، اور انگریز سے خان، خان سے سردار، سردار سے وڈیرہ سب کے سب عام فرد اور اس کے آدرشوں کے وَیری بن چکے ہیں........... بابو اُس ماحول وزماں میں سامراج دشمنی کا جھنڈا بلند کرتے ہیں۔

وہ عملاً ایک قبرستان میں ''جاگتے رہو' کی صدائیں بلند کرتا ہے، نثر، شعر، مضمون، تار، کارڈ اور فوٹوگرافی کی زبان میں زبان کاٹ دیے جانے کی سزا والی باتیں کرتا ہے، وہ مرگی ماری سی آئی ڈی اور اذیت پسند پولیس کو تعاقب میں رکھے زقندیں بھرتا جاتا ہے، اصلی نقلی چھوٹے موٹے حادثوں سے دوچار ہوتا ہے۔ بے درمانی کی پسلی توڑ اذیتیں سہتا ہے، بے دولتی کے معدہ سکیڑ فاقے جھیلتا ہے مگر وطن کے گیت گاتا جاتا ہے۔ اِس یقین کے ساتھ کہ وہ مہردار کے پیچھے سے کاذب رات، صادق صبح میں ضرور ڈھلے گی۔

بابو دل کے ایک ایک خلیے سے سمجھتا ہے کہ ہم کامیاب ہونگے اس لئے کہ ہم حق پر ہیں۔ ہزاروں دردمند دلوں کی طرح یہ عاشق بھی آزادی کے عشق کی عمیق آگ میں جلتا رہتا ہے۔ وہ رسالے کے نمبر پہ نمبر چھاپتا رہا، روتا تڑپتا رہا، سیہون وست گھرا بھٹکتا رہا محض اس لئے کہ وہ اپنی کامیابی پر یقین رکھتا تھا۔ وہ انگریز، لیاقت علی، سکندر مرزا، ایوب اور یحیٰی خان کی فرعونیت بھگتتا

رہا............ بالآخر آدھا کامیاب ہوا۔ بلوچستان صوبائی درجہ پا گیا۔ (اور یہ اُس زمانے کے لحاظ سے ایک بہت بڑی کامیابی تھی)۔

اولین شفاف الیکشن آئے تو یہ دیوانہ پھر بابو عبدالکریم کی طرح دیوانہ وار اپنی پارٹی کیلئے کام کرتا رہا۔ صحت صفر ہوگئی، بچوں کی روٹی گھٹتی رہی مگر نئے عہد کا یہ منادی گر ''نوکیں دور'' کے نوکیں دور کو آندھیوں سے بچاتے رہنے میں خود کو جھونکتا ہی رہا۔

نیشنل عوامی پارٹی الیکشن میں کامیاب ہوئی تو یہ دیوانہ بہت خوش ہوا اور جب نیپ کی حکومت بن گئی تو وہ کپڑوں میں نہ سمانے لگا۔ توقعات بھری صبح بالآخر طلوع ہو ہی گئی، ایسے شخص کیلئے صبح ہوگئی جس نے اس صبح کی کشتی کو اپنی شریانیں مہیا کی تھیں۔ کھینچ لایا تھا وہ اس صبح کو اپنی ناتوانی کی طاقت سے، ہفت زمین گہرے استقلال سے، اور ہو چی من جیسی جدوجہد سے۔

جب اس نے اپنا کام مکمل کرلیا، اپنا رول پورا کرلیا تو ہانپتا کانپتا، نیم جاں بابو صبح کے دروازے پر ہی بے ہوش ہوگیا۔ اس ایقان کے ساتھ کہ قافلے والے اسے اٹھائیں گے، اسے سنبھالیں گے، اس کے بچوں کے منہ میں نوالہ ڈالیں گے......مگر اس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا کہ ساتھی کان نہیں دھر رہے، اس کی دلجوئی نہیں کر رہے، اس کے نوکیں دور کو آکسیجن سلنڈر کے قریب نہیں لے جا رہے۔ اس نے جان لیا کہ اُس کے سب سکّے کھرے نہیں تھے، اس کے رفقا بلوچی زبان کے واحد ہفت روزے اور اس کے ایڈیٹر کے بچوں کو زندہ رکھنے کی بہ نسبت ''دوسرے'' فرائض کو اولیت دے رہے تھے۔ عرصے تک زن کندن میں پڑے بابو نے جب عام بڈھے بلوچ کی پیٹھ سے لگے پیٹ کے حجم میں کوئی تبدیلی نہ دیکھی تو اپنی موت کی دعائیں مانگنے لگا۔ جی ہاں، زندگی کا پیغام گھر گھر پہنچانے والے ڈاکیا نے جب زندگی کو مرگھٹ سے جنبش نہ کرتے دیکھا تو اسے یقین ہوگیا کہ کارواں میں کچھ کھوٹ رہ گیا تھا، عمل میں کچھ سقم رہ گیا تھا، نظریات میں کچھ ابہام رہ گیا تھا۔......مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ کارواں میں کھوٹ نے اپنا زہر پورے کارواں کی روح کے پورے جسم میں پھیلا دیا تھا۔ مادرِ وطن کے بیٹوں کے جرم کا کفارہ مادرِ وطن ہی ادا کرتی ہے ....بابو کا دل پھٹ گیا، اسے مادرِ وطن کے سینے ہی میں جگہ ملی۔ جو بلاشبہ وزارتوں کے مزین

کمروں سے زیادہ راحت انگیز تھی۔

تاریخ میں بھی اُسے گم کردینے کے خواہش مندوں کے عزائم پورا نہ ہونے دینے کی نیت سے ہم اپنے اس بزرگ کامریڈ کو ریکارڈ پر لا رہے ہیں۔ یوں کرنے سے شاید ہم اہلِ وطن پر اس کا کچھ قرضہ کم ہو، شاید سرزمین پر اس کا کچھ قرض کم ہو۔ سرزمین جس کا قرض چکاتے چکاتے وہ خود معدوم ہوگیا، اس کا قافلہ معدوم ہوگیا............اس کے آنے والے بچوں کا قافلہ معدوم ہوتا رہے گا۔

شاہ محمد مری

6 جولائی 2011

اظہارِ تشکر

میں بابو عبدالکریم کے بڑے صاحبزادے شیہک کریم کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تکمیل کے لئے ''نوکیں دور'' کی فائلیں اور بابو کے جاری کردہ کارڈ اور ٹیلیگرام مطالعہ کے لیے مہیا کیں۔

جیسا میں نے اُسے دیکھا

عمر ہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا زِ بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

بابو عبدالکریم امن کو میں نے پہلی بار کوئٹہ کے ڈان ہوٹل میں دیکھا تھا۔ ڈان ہوٹل بلوچستان کی سیاسی ،ادبی اور سماجی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ ہوٹل بھی کوئٹہ کے دیگر بڑے ہوٹلوں کی طرح ایرانیوں کی ملکیت تھا۔ پچھلی صدی کی ستر اور اَسی کی دہائیوں میں یہاں کے ہوٹل مختلف سماجی ،سیاسی اور ادبی گروہوں کے ٹھکانوں کے بطور مخصوص ہوا کرتے تھے۔ جناح روڈ کے انتہائی شمالی سرے پر گوشہ ادب کے سامنے لبرٹی ہوٹل ہوا کرتا تھا، جہاں پر مرحوم عبدالرحمٰن ایسوٹ کے پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن والے بیٹھا کرتے تھے۔ یہی ہوٹل پاکستان سوشلسٹ پارٹی،سوشلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن اور پاکستان ٹریڈ یونین فیڈریشن کے کارکنوں کا بھی اڈہ تھا۔ نیچے آئیں تو ریگل ہوٹل آئے گا۔ یہ پشتونخوا ملی عوامی پارٹی کا بیٹھک تھا۔ اس ہوٹل کے عین سامنے فرح ہوٹل واقع ہے جو کہ بڑے بڑے بیوروکریٹوں، ٹھیکیداروں اور بڑے لیڈروں کا ''اشراف خانہ'' تھا۔ اونچے درجے کے اس ہوٹل میں کبھی کبھار صاحب لوگ کافی بھی پیتے تھے جو کہ بلوچستان

میں ایک انوکھا اور ''عیاشی'' والا مشروب تصور ہوتا تھا۔ جنوب کی طرف اسی جناح روڈ پر واقع فردوسی ہوٹل میں پیٹی معاشی گروہ کے افراد بیٹھا کرتے تھے۔ اس سے ذرا جنوب کی طرف چوک پر ڈان ہوٹل واقع تھا۔ لیاقت روڈ والا کیفِ ایران اور مشن روڈ والا کیفِ صادق شہر میں نو آمد عناصر' طالب علموں اور عام لوگوں کے لئے عجوبہ تھے۔ وہاں خصوصاً کیفِ ایران میں دیواروں پر چاروں طرف آئینے لگے ہوتے تھے۔ اس کی اصل دیواروں کا پتہ ہی نہیں چل سکتا تھا۔ آئینوں میں اندر کے لوگ ہی نظر آتے اور اس طرح یہ بہت بڑی جگہ لگتی تھی۔ یہاں گراموفون پر فرمائش پہ گانوں کے ریکارڈ لگائے جاتے تھے۔ پرانے مغموم گانے' محبوبوں کے مسترد کردہ عاشقوں کے جلتے دلوں کو آکسیجن مہیا کرتے تھے جبکہ شوخ و چنچل گانوں کی فرمائشیں ان لوگوں کی طرف سے چٹ پر لکھ کر بیرے کے ہاتھوں کاؤنٹر تک پہنچ جاتی تھیں، جنہیں محبت کی انمول نعمت حاصل تھی۔

میزان چوک پر قائم المرکز ہوٹل بھیڑ بکریوں کی تجارت سے وابستہ لوگوں کا مرکز تھا ، جہاں عام دیہاتی لوگ بڑی بڑی ڈانگیں (لاٹھیاں) لئے چند لمحوں کے لئے پیڑی (منڈی) سے نکل کر اپنی تھکاوٹ دور کرنے یا پھر قیمتوں پر مول تول کرنے بیٹھ جاتے۔ دیہاتی لوگ ہمیشہ اونچی اونچی آواز میں بولتے ہیں اور ایک فقرہ دو تین بار دہراتے جاتے ہیں اور تکیہ کلام کے طور پر اپنے مخاطب سے پوچھتے رہتے ہیں ''پوہ بیئغے'' (سمجھ گئے؟)۔ ان لوگوں میں بات کا سمجھنا بہت ضروری ہوتا ہے ،اس لئے کہ ان کی ہر بات کا مطلب ہوتا ہے ،لفظ کی اہمیت ہوتی ہے، ان کا اقرار نامہ معاہدہ، تحریر، ریکارڈ سب کچھ زبانی کلامی ہوتا ہے، اس لئے زبان بڑی تقدس والی شے ہوتی ہے۔ جبھی تو وہ قول دیتے ہوئے کہتا ہے: ''مجھے زبان ہے کہ فلاں کام فلاں روز کروں گا'' ''ھبر'' (لفظ) کہا بھی تو قول ہوگیا۔ ''بے زبان'' کا لفظ بلوچی میں گونگے کے لئے نہیں بلکہ بے اعتبار آدمی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ المرکز ہوٹل میں بہت خوبصورت روایت اور بھیانک تاجرانہ حربوں کا امتزاج موجود ہوتا۔ دل مل گئے تو فیاضی کے ساتھ کیک پیس بھی منگایا جاتا اور ہر تصنع سے ماورا ہو کر داڑھی، مونچھیں، قمیص اور ہاتھ ''پیس آلود'' کیے جاتے۔

ڈان ہوٹل شہر کے دیگر سارے ہوٹلوں سے ممتاز اور یکتا تھا۔ یہ کسی خاص سیاسی و ادبی

گروہ کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ یہاں مختلف بولیاں بولنے والے اور مختلف سماجی پرتوں سے تعلق رکھنے والے حضرات (خواتین کب ہوٹلنگ کرتی ہیں!) بیٹھا کرتے تھے۔ یہ انسانوں کا جنرل سٹور تھا جہاں ہر علاقے اور ہر عمر کے لوگ براجمان رہتے ۔ یہ جگہ ہر وقت دانشوروں، سیاست دانوں اور سیاست کاروں، عوامی تنظیموں کے کارکنوں، راہنماؤں اور راہزنوں، شاعروں، شاطروں، ادیبوں اور ادبی مافیا کے ممبروں، ایڈیٹروں اور آڈیٹروں سے بھری رہتی تھی۔۔۔۔اور سیاستدانوں کی رونق میں اضافے کے لئے یہاں سی آئی ڈی والے بھی ہمیشہ موجود رہتے تھے۔

یہ گویا سفید پوش مڈل کلاس سے وابستہ لوگوں کا ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ ریاست قلات کی طرح اس میں دو حصے (ایوانِ خاص اور ایوانِ عام) ہوا کرتے تھے۔ ایوان خاص ایئر کنڈیشن کمرہ تھا۔ ایئر کنڈیشن ہمارے صوبہ میں بھی کوئی خاص رعب نہیں جما سکا۔ پنجابی ناشکروں نے تو اسے اس قدر حقیر بنا ڈالا کہ وہاں انہوں نے ایئر کنڈیشن بسوں اور کوچوں کا نام (ٹھنڈی بس) رکھ دیا۔ اگر گرم موسم کو ٹھنڈا یخ کرنے والا ایئر کنڈیشن انگریز کے زمانے میں اُس کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ یقیناً پورے بلوچستان پر ایک بھی گولی چلائے بغیر قبضہ کر چکا ہوتا۔ جنرل ڈائر نے صرف اپنی کار موٹر کو جادو کا کمرہ قرار دے کر نوشکی کے پورے علاقے کو اس قدر زیر کر لیا تھا کہ لوگ اس سے بارش کی دعائیں کرنے کی درخواستیں کرتے۔ ایک بار تو اس غیر مسلم کی دعا سے بارش برسی بھی تھی!

ڈان ہوٹل کے ایئر کنڈیشن والے حصے میں کرسیوں کے بجائے صوفے رکھے ہوئے تھے جسے بلوچ ''صُوفہ'' کہتے ہیں۔ اس حصے میں کام کرنے والے بیرے شکل وصورت اور لباس میں اجلے ہوتے تھے۔ یہاں چائے کا ریٹ عام حصے کی بہ نسبت زیادہ تھا۔ اور ٹپ بھی ذرا زیادہ دینی پڑتی تھی۔

ڈان ہوٹل کا دوسرا حصہ عام درمیانہ طبقے کے لوگوں کے لئے تھا۔ یہی حصہ بابو عبدالکریم کا بھی اڈہ تھا۔ یہیں عام سیاسی کارکن بیٹھ کر اپنے پریس ریلیز لکھتے یا اپنا چھپا ہوا بیان بار بار پڑھتے اور فخریہ انداز میں دوسروں کو دکھاتے۔ اخباری بیان کا چھپنا سیاسی کارکنوں کے لئے ایک سٹیٹس سمبل ہوا کرتا ہے۔ (ہمارے علاقے میں تو یہاں تک مشہور تھا کہ اخباری بیان چھاپنے کے لئے سو روپیہ

فیس دینی پڑتی ہے اور ڈویژنل کمشنر کی منظوری بھی چاہئے ہوتی ہے)۔

ڈان ہوٹل کے اس حصہ میں آپ کو کہیں کوئی شاعر بیٹھا نظر آتا جو اپنے دوستوں کو اپنا تازہ کلام جبراً سنا رہا ہوتا۔ چھ آٹھ مصرعوں پر مشتمل غزلوں کا رواج ابھی حال ہی میں پڑنا شروع ہو گیا ہے۔ تین مصرعوں والے ہائیکو کا تو تصور ہی نہ تھا۔ حالانکہ کچھ دوست بلوچی ''ڈیھی'' کی ایک صورت کو جاپانی ہائیکو کی ایک صورت بنانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں جیسے کہ مذہبی راہنما سائنس کی ہر نئی دریافت کو اپنی روحانی کتابوں میں سے اخذ کردہ قرار دیتا ہے۔

دانشورانہ بحثیں رواں دواں تھیں۔ جب دیر ہو جاتی تو وقفہ کا اعلان کیا جاتا اور اگلی بیٹھک میں کسی بھی میز پر یا بیک وقت دو دو میزوں پہ بحث شروع ہو جاتی۔ ڈان ہوٹل میں بیٹھنے والے صحافی بھی جانے پہچانے سے تھے۔ اس وقت کوئی پریس کلب نہیں تھا۔ کوئی رشوت وغیرہ کا لمبا اور ننگا سلسلہ بھی نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ چائے کا ایک کپ کسی نے پلا دیا۔ وہ بھی روایت اور ادب و عزت کے دائرے میں۔

الغرض کیفِ ڈان بہت عرصے تک ہر قسم، ہر عمر اور ہر مکتبہ فکر کے لوگوں کا ثقافتی و اطلاعاتی مرکز رہا۔ ایک پوری نسل نے یہیں پر سیکھا کہ Separate چائے کیا ہوتی ہے۔ اس چائے میں دودھ چینی کے تناسب میں ہمیشہ گھپلا ہوتا تھا۔ میرے ایک عزیز نے چائنا ہوٹل میں Soup کے پیالے میں مائع سرخ مرچ کا ایک پورا چمچ سرکہ سمجھ کر ڈال دیا اور پھر اصلی بلوچ بن کر سارا وقت یہ سوپ کھاتا رہا۔ اس طرح کہ دونوں آنکھوں سے آنسو رواں تھے، ناک بہہ رہی تھی اور منہ سے شوں شوں کی آوازیں تیز رفتاری اور بلند آہنگی سے آ رہی تھیں۔ چونکہ اس چائے کے لئے لوگوں کا ذوق (Taste) بنانا تھا اس لئے بس فیشن کے بطور یہ ماڈرن کام کرنا پڑتا۔

دیگر ایرانی ہوٹلوں کی طرح یہاں بھی بیرے کشمیری ہوتے تھے۔ کمسن، خوبصورت اور مودب۔ یورپ میں سیلز گرلز ہوتی ہیں، مشرق میں سیلز بوائز! بیروں کی وردی سفید ہوا کرتی تھی۔ چائے serve کرنے اور برتن لے جانے کے بعد وہ ایک پلیٹ میں کاغذ پہ لکھا ہوا چائے کا بل لاتا اور ادب و امید کے ساتھ میز پر رکھتا اور خود اٹینشن ہو کر کھڑا ہو جاتا۔ بل دینے والا مطلوبہ رقم ادا

کرنے کے علاوہ کچھ اضافی پیسے بھی ٹپ کے طور پر پلیٹ میں رکھ دیتا۔ بیرا شکریہ کہتا ہوا اپنی پلیٹ سنبھالتا، اضافی رقم اپنی جیب میں ڈالتا اور اصل بل کے پیسے کاؤنٹر پر مالک کو دے دیتا۔

دیہاتی لوگ ڈان یاترا کے بعد اپنے علاقوں میں واپس جا کر ساری روداد تفصیل سے بیان کرتے اور سامعین حیرت و دلچسپی سے یہ انہونی باتیں سنتے جاتے۔ اضافی رقم کو ٹپ کہا جاتا تھا۔ ٹپ کو الٹا کر دیں تو یہ بلوچی زبان میں ایک گالی بن جاتی ہے مگر سرمایہ داری نظام تو خود ایک گالی ہوتا ہے۔ یہ ذلتوں کا نظام ہوتا ہے۔ لہٰذا آج جا کر بلوچوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ ان کے صوبے میں زندگی کے ہر شعبہ میں ٹپ ہی ٹپ کا راج ہے۔ کہیں کمیشن کے نام پر، کہیں فیس، کہیں کک بیک اور کہیں کنسلٹنسی کے نام پر۔

ہوٹل کا بل دینے کے پیچھے بھی عجیب سازشیں اور قصے ہوتے ہیں۔ تلواروں کی لڑائی میں جواں مرد اور بہادر وہی شخص ہوتا ہے جو انتہائی دلیری اور پھرتی سے تلوار کے سامنے جائے، اپنے ساتھیوں، دوستوں اور عزیزوں میں سب سے پہلے بل ادا کرے۔ ہوٹل کا کاؤنٹر بھی تو ایک قسم کا تلوار بردار دشمن ہوتا ہے۔ ہر جواں مرد اپنے ساتھیوں کو کہنیوں سے پیچھے دھکیلتے ہوئے، قسم اور طلاق کھاتے ہوئے سب سے پہلے کاؤنٹر پر پہنچتا ہے اور اپنا ذاتی وقار و ناموس سمجھ کر ہر ممکن طریقے سے بل ادا کرتا ہے۔ اور بل کی ادائیگی کا یہ عمل جنگِ نفسک کا منظر نامہ بن جاتا ہے۔

تنگدستی کا غالب ہو جانا ایسے موقوں پر ندامت سے مار دیتا تھا۔ مگر یہاں بل نہ دینے کے عادی مجرم بھی موجود ہوتے تھے، جو یا تو ویسے ہی پیچھے رہ جانے والے آخری سرے کے بزدل ہوتے تھے یا پھر اٹھتے ہی تھوڑی سی مزاحمت میں ہی ہتھیار ڈالتے، اور یا کاؤنٹر پر جا کر اپنی جیبیں ٹٹولتے رہتے جب تک کہ بہادر جوہر دار تیغ کاٹ چکا ہوتا۔ کئی لوگوں کے پاس تو بل ادا کرتے وقت ایک ہی بڑا کم بخت نوٹ ہوتا تھا جس کا ٹوٹا ملتا ہی نہ تھا۔ قدِ آدم آئینے لگے ہوئے ہوٹلوں میں بل نہ دینے والے کئی عادی مجرم اس وقت پتلون کی جیب سے کنگھی نکال کر آئینے کے سامنے زلف سنوارنے کھڑے ہو جاتے جب بل ادا کرنے کا وقت ہوتا تھا۔ بعد میں وہ اپنے ساتھیوں کے سامنے کھڑے اتراتا بھی تھا کہ ''دیکھو فلاں کو کس طرح بیوقوف بنا کر اس سے ہوٹل کا بل دلوایا میں

نے......'' غیرت والے کو شہر میں نرم ترین الفاظ میں ''بے وقوف'' کہتے ہیں۔

ڈان ہوٹل میں ایک ہی مفت اخبار ہوا کرتا تھا جسے پڑھنے کے لئے سو بیمار انتظار کے عذاب میں بیٹھے ہوتے۔ وِل ڈورانٹ سچ کہتا ہے کہ آج کے انسان کے جینز میں پتھر کے زمانے کے انسان کی عادتیں موجود ہیں جس وقت کہ شکار کم ہوتا تھا اور انسان ایک دوسرے کا شکار چھین کر اسے قتل کر دیا کرتا۔ ڈان ہوٹل کا اخبار اور اس پر چھینا جھپٹی بالکل اسی دور کی یاد دلاتا تھا۔ پھر جس کم بخت کے ہاتھ میں غنیمت کا یہ خزانہ آ جاتا تو وہ تو اشتہار تک پڑھ لیتا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ کئی لوگ اسے پڑھنے کے لئے بے تاب ہیں۔ یہ ہے قبائلی معاشرے کا Sadism!

ڈان ہوٹل میں ٹوائلٹ کی سہولت بھی موجود تھی جس کی اندرونی دیواروں پر ''اوپر دیکھو، دائیں دیکھو......'' جیسی بکواسیات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہوتا۔ تقریباً ہر سیاسی پارٹی اور طلبہ تنظیم کی زندہ بادی کی خواہش بھی لکھی ہوتی تھی۔ وہاں حاکمِ وقت کی عزیزہ اوں اور اقاربہ اوں کے علاوہ خود اُس کے اپنے نام بھی بڑی ڈھیٹ گستاخیاں لکھی ہوتیں۔

لوگوں کو اسی ہوٹل میں یہ معلومات بھی حاصل ہوتی تھیں کہ بوٹ پالش کرنے کا ایک علیحدہ ''کاروبار'' وجود میں آ گیا ہے۔ پالشی اپنے ہاتھ میں ہوائی چپل لئے ہوٹل میں داخل ہوتا اور بڑے سٹائلش انداز میں ''پالس ش ش'' کہتا ہوا گزرتا۔ جس کو جوتا پالش کروانا ہوتا، وہ اپنے جوتے اتار کر اسے دے دیتا اور خود ہوائی چپل پہن لیتا۔ جوتے چمکتے ہوئے واپس آتے، ہوائی چپل واپس لے لئے جاتے اور اجرت ادا کی جاتی۔ مارکیٹ اکانومی کے تضادات دیکھئے: کہاں تو خدا کے گھر یعنی مسجد سے جوتے چرانے کا معمول اور کہاں جوتے دور لے جا کر پالش کر کے واپس پہنچا دینے کا معتبر وطیرہ! ''واہ سرکار۔ تئی کمال!''

افسوس کہ ڈان ہوٹل اب بند ہو چکا اور اس کی جگہ ایک بینک نے اپنا سرمایہ دارانہ دھندہ شروع کر دیا۔ زندگی، دکاں کے نام ہو گئی۔

یہ ستر کی دہائی کے اوائل کے برس تھے، جب ہم بھی کبھی کبھی ڈان آنے جانے لگے تھے۔ پسماندہ کلچر کے لوگ جب ایک بار ''جناح روڈ کلچر'' کی چکا چوند میں داخل ہو جاتے ہیں تو

پھر معاملہ جز وقتی نہیں رہتا۔ بہت سی اَن دیکھی مقناطیسی قوتیں غیر محسوس طور پر سختی سے جکڑ لیتی ہیں۔ ہر سماج کنزیومر معاشرے میں غیر محسوس طریقے ہی سے تبدیل ہو جاتا ہے۔

ڈان ہوٹل کی اسی پُر شور دُنیا میں ایک شخص چمڑے کا بیگ ہاتھ میں لئے داخل ہو جاتا۔ اس نے نظر کی عینک لگائی ہوتی تھی۔اس کا رنگ گورا تھا۔سر کے بال کم اور پیچھے کئے ہوتے۔ بابو عبدالکریم شورش جو'اب کریم امن بن چکے تھے' کی پہچان ہی یہ تھی کہ انہوں نے پرانا سا کوٹ پہنا ہوتا۔ چمڑے کا بیگ ہاتھ میں اور گلے میں ایک مفلر ہوتا اور کارڈ ہاتھ میں ہوتے۔ جونہی وہ ہوٹل میں داخل ہوتے تو ہر میز پہ موجود لوگ دل کی گہرائی سے دعا کرتے کہ وہ ان کے پاس نہ آئیں؛۔ کچھ اونچی آواز میں جبکہ بزدل لوگ زیر لب' اور وضعدار لوگ دل میں۔مگر بابو آ ؤ تاؤ سب جھٹک کر آن دھمکتے ،بغیر کسی باضابط و بے ضابطہ دعوت کے اور ہر حیل و حجت پر لعنتیں برساتے ،فٹافٹ ہاتھ اپنے بیگ میں ڈالتے اور ایک کارڈ نکال کر دلبرانہ ادا سے اہلیانِ میز کو پیش کرتے۔

یہ میرے میڈیکل کالج میں طالب علمی کے اولین سال تھے۔میں نے عبدالکریم امن کو سائیکل پر بھی جلوہ گر دیکھا۔کبھی کسی دفتر میں،کبھی کسی دانشور یا سیاسی ورکر کے ہاں۔

میں نے ذرا ''ہوش'' سنبھالا تو معلوم ہوا کہ وہ کوئی اخبار چلاتے رہے۔مگر یہ کہ اُن کے سیاسی دوستوں نے ان سے دغا کی۔اقتدار کی کرسی پر بیٹھتے ہی اس سے نگاہیں پھیر لیں۔لہٰذا' اب یہ بوڑھا شخص بے یار و مددگار ''کارڈ فروشی'' کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔بابو کی حالت کو دیکھ کر نیپ مخالف عناصر کو اپنے موقف پر ایک طرح کا اطمینان ہوتا تھا کہ چلو نیپ والوں نے تمہیں بھی نیم پاگل بنا دیا۔

پھر جب سائیں کمال خان شیرانی ،عبداللہ جان جمالدینی اور ڈاکٹر خدائیداد سے شناسائی ہوئی تو معلوم ہوا کہ بابو عبدالکریم بہت بڑے انسان ہیں۔ان کے لئے دل میں کچھ احترام ،کچھ ہمدردی پیدا ہوئی مگر اُن سے ملاقات نہ ہو سکی اور سیاست ،ضیا دشمن سرگرمیوں اور وارنٹس کی وجہ سے بلوچستان بدری کے بعد جب میرے سینئر اور اساتذہ ڈاکٹروں نے میرے وارنٹ ختم کرا کے مجھے نوکری دلوادی تو میں اپنے دائرہ کار سے ہی جلاوطن ہو گیا تھا۔مجھے ژوب بھیج دیا گیا اور بابو سے

میری کوئی لمبی چوڑی ملاقات نہ ہوئی۔مگر اس دوران سائیں کمال خان کی خلیفہ گیری نے مجھے نیپ کے سب سے بڑے لیڈر میر غوث بخش بزنجو کا بھی مرید بنوا دیا تھا، بابو تو پھر ایک لٹ ،ایک انقلابی کی حیثیت سے میرے دل و دماغ میں گھر کر چکے تھے۔

مگر ان سے ملاقات ہوئی بھی تو اس حال میں کہ وہ مجھے کچھ سکھا سکنے کے قابل نہ رہے تھے۔صرف عبرت ہی سے کچھ سیکھا جا سکتا تھا۔حتیٰ کہ عبدالکریم امن سائیکلوں سے گر گر کر ،سماجی و معاشی طور پر ٹھوکریں کھا کھا کر اور سیاسی رفیقوں کے کچوکے سہہ سہہ کر مر گئے۔ ہمارا **سٹیزن ٹام پین** مر گیا۔ہمارا **آہ کیو** مر گیا۔

حواشی:

ٹام پین: سٹیزن ٹام پین جو برطانوی باشندہ ہوتے ہوئے بھی' اپنے ہی وطن کے خلاف امریکہ کی آزادی کا راہنما بنا، فرانس میں انقلاب کا نقیب بنا، اور تحریر و تقریر سے' بحث و دلائل سے عوام الناس کو کامن سنس پہ قائل کرتا رہا۔

آہ کیو: چین میں ایک جاگیر دار دشمن کریکٹر جسے چینی مصنف لوہسون نے اپنے قلم سے سینچا سنوارا اور لازوال بنا دیا۔

حسب نسب

عبدالکریم جس کی قسمت میں ہیرو بننا نہیں لکھا تھا، 1911ء میں کاریز سور مستونگ میں پیدا ہوئے۔ وہ حاجی محمد قاسم خان کے بیٹے تھے جو کہ بلوچوں کے رند قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے بلوچ جن کی مادری زبان بلوچی کے ہاتھوں پیوند پیوند فارسی ہے' جسے دیہواری کہتے ہیں۔ بابو اپنے والد کی وفات کے چار ماہ بعد پیدا ہوئے تھے۔ بابو کے والد نے دو شادیاں کی تھیں۔ دونوں سے ایک ایک بیٹا ہوا، پہلی زوجہ سے عبدالحکیم اور دوسری زوجہ سے عبدالکریم۔

بابو کی والدہ بی بی زر بانو تعلیم کے بارے میں بہت سخت اور سنجیدہ تھیں۔ وہ بہت باقاعدگی اور سختی سے بابو کو سکول بھیجا کرتی تھیں۔ مگر ریاست کلات میں چونکہ کوئی ہائی سکول نہ تھا اس لئے وہ اپنی تعلیم مزید جاری نہ رکھ سکے۔ اور ان کی تعلیم مڈل تک ہی رہی۔

بپتسمہ سیاست میں

بابو عبدالکریم کے ماموں کا نام عبدالرحیم تھا جو کہ خواجہ خیل قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ بلوچستان کی سیاست میں بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ دراصل انہی کو دیکھ دیکھ کر بابو کو سیاست کا چسکا پڑا تھا۔ اور یہ ہونا بھی تھا اس لئے کہ اُس زمانے میں یوسف عزیز مگسی کی تحریک اپنے عروج پر تھی اور عبدالرحیم خواجہ خیل اس تحریک کے بہت فعال رہنما تھے۔ بابو اس زمانے میں ملازمت کرتے تھے۔ نہ صرف بابو بلکہ اس وقت سیاست سے وابستہ تمام رہنما ملازمت پیشہ ہوا کرتے تھے۔

1935 میں کوئٹہ میں زبردست زلزلہ آیا۔ بابو اس زمانے میں گلستان میں پٹواری تھے۔ ان کی عمر اس وقت 23 سال تھی۔ ڈاکٹر خدائیداد نے لکھا کہ اُن کے بچپن کے زمانے میں بابو گلستان میں پٹواری کی نوکری کرتے تھے، جو بعد میں انہوں نے ''آزادیِ وطن'' کے جذبے تلے ترک کر دی۔ (1) اپنے خاندان اور احباب کا غم انہیں کوئٹہ میں ٹکنے نہ دے رہا تھا۔ وہ سواری نہ ملنے پر پیدل ہی مستونگ روانہ ہوئے۔ کوئٹہ سے تقریباً 13-14 میل کے فاصلے پر ہزار گنجی کے مقام پر پہنچے تو جانے کیا خیال آیا کہ انہوں نے اسی جگہ کو اپنی قبر کے لئے منتخب کیا۔ (2)

حوالہ جات

1۔یوسف زئی،ملک فیض محمد۔یادداشتیں۔صفحہ 150

2۔خدائیداد،ڈاکٹر،نوکیں دور۔جنوری1994۔صفحہ 7

ملک عبدالرحیم خواجہ خیل

ملک عبدالرحیم بلوچستان کے مردم خیز علاقے ،مستنگ کے خواجہ خیل گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام ملک موسیٰ خان تھا۔ ملک صاحب نے مستنگ میں ہی تعلیم حاصل کی ۔اور 1930ء میں آپ نے ملازمت اختیار کی۔

ملک صاحب ترقی پسند سوچ کے مالک تھے جو اپنے وطن اور قوم کو دیگر ترقی یافتہ اقوام کی صف میں کھڑا دیکھنا چاہتے تھے۔بیسویں صدی کے آغاز میں سوویت انقلاب ہوا تو دنیا بھر میں سرمایہ دار ممالک کے زیر تسلط نوآبادیات میں محکوم قوموں کی آزادی کی تحریکوں نے زور پکڑنا شروع کیا ۔1925-26ء میں میر عبدالعزیز کرد اور ان کے رفقا نے ایک طلبہ انجمن بنائی اور بعد میں اس کا نام انجمن اتحادِ بلوچاں رکھا۔کچھ دنوں بعد ملک عبدالرحیم خواجہ خیل ،ملک فیض محمد یوسف زئی اور شورش بابو حلف اٹھانے آئے ۔ باقی ساتھیوں سے حلف لیا گیا لیکن شورش صاحب کو کم عمری کی وجہ سے حلف نامے میں شامل نہیں کیا گیا۔شورش صاحب اس بات سے مایوس نہ ہوئے بلکہ انہوں نے اپنی کم عمری کے باوجود پارٹی کے لئے زیرزمین سرگرمیاں دوسروں کے ساتھ شروع کیں۔ بابو کی سرگرمیاں دیکھتے ہوئے کچھ عرصے بعد کمسنی ہی میں انہیں ممبر بنالیا گیا۔

انجمن اتحادِ بلوچاں ایک ایسی تنظیم تھی جو خفیہ طور پر کام کر رہی تھی۔اس کو اس قدر خفیہ رکھا

گیا تھا کہ اس کے تمام ممبرات کو میر عبدالعزیز کُرد کی بیٹھک، عزیز آباد مستونگ میں جمع ہو جاتے اور صبح روشنی پھیلنے سے قبل اپنے اپنے گھروں کو واپس پہنچ جاتے۔ ملک فیض محمد یوسفزئی صاحب روزانہ چھ سات میل کا سفر پیدل طے کر کے پڑنگ آباد سے مستونگ جاتے۔

انجمن کی ممبر سازی کا طریقۂ کار بھی خفیہ ہوتا تھا۔ کسی نئے آنے والے کو اس وقت تک مقاصد سے آگاہ نہیں کیا جاتا تھا جب تک کہ اس کو اعتبار کے قابل نہ سمجھا جاتا۔ اس دوران اس کو ٹرائل بیس پر اچھی طرح پرکھا جاتا۔ اس کے بعد حلف لیا جاتا۔ حلف بھی بہت ہی دلچسپ انداز میں لیا جاتا تھا۔ ممبروں سے قرآن شریف کی سورہ یٰسین کے حاشیہ پر دستخط لئے جاتے کہ وہ ہمیشہ انجمن کا وفادار رہے گا اور سرکار کے سامنے کوئی راز افشاں نہیں کرے گا۔

اُن لوگوں کی رفاقت کچھ دیگر ترقی پسند انقلابی نوجوانوں کے ساتھ تھی جنہوں نے بلوچ قوم کو باوقار و آزاد قوم کے بطور قائم کرنے کے لئے قرآن شریف پر دستخط کر کے حلف لے رکھا تھا۔ ان میں محمد اعظم شاہوانی، سید امیر شاہ، ملک سعید دہوار، اور دیگر شامل تھے۔ ملک فیض صاحب لکھتے ہیں کہ جب میر یوسف عزیز مگسی کو گرفتار کر کے مستونگ جیل لایا گیا تو وہاں انجمن کے ممبروں نے ان سے خفیہ رابطہ کیا۔ اور ممبر بننے کی دعوت دی۔ ان سے رابطہ، خطوط کے ذریعے ہوتا تھا جسے جیل میں صفائی کرنے والا سویپرا اپنے جھاڑو میں چھپا کر لے جاتا۔ میر یوسف علی خان مگسی شامل ہوئے تو تحریک میں ایک نئی جان پیدا ہوگئی۔

زقندیں بھرتی ہوئی قومی آزادی کی تحریک کو اس وقت تباہ کن جھٹکا لگا جب زلزلہ نے یوسف عزیز مگسی کی جان لے لی۔

دسمبر 1933ء میں منعقد شدہ آل انڈیا بلوچ کانفرنس میں باقی بزرگوں کے ساتھ ساتھ شورش صاحب نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس کے بعد تو ایک سرگرم روح اور متحرک جسم لئے بابو بلوچستان کی ہر سیاسی اور سماجی تحریک میں آگے کی صفوں میں موجود رہے۔

اس دوران 1936ء میں میر محمد فاضل خان محمد شہی نے مستونگ میں بلوچ ملازمین کی فلاح و بہبود کی خاطر ایک غیر سیاسی جماعت 'انجمن اسلامیہ کے نام سے قائم کی۔ میر گل خان نصیر اس

انجمن کے صدر تھے اور ملک عبدالرحیم خواجہ خیل جنرل سیکرٹری تھے۔ کریم امن صاحب اس میں دفتری خط و کتابت اور پروپیگنڈہ کا کام کرتے تھے۔

اب دیکھئے کہ 1938ء میں ''استقلال'' کے نام سے ایک ہفت روزہ کا اجرا کیا گیا۔ اس کے لئے لوگوں سے چندہ کر کے ایک پرنٹنگ پریس لگایا گیا اور اس کا نام جناب یوسف عزیز مگسی کے نامِ نامی پر ''عزیز پرنٹنگ پریس'' رکھا گیا۔ یہ بلوچستان کا اولین پریس تھا۔ اخبار کے ادارۂ تحریر میں بابو عبدالکریم بھی شامل تھے۔

زلزلے کے چند سال بعد 1937ء میں ان دوستوں نے قلات نیشنل پارٹی بنالی۔ اس کے صدر کرد صاحب تھے، نائب صدر میر گل خان نصیر تھے اور ملک فیض محمد یوسف زئی جنرل سیکرٹری تھے۔

میر عبدالعزیز کرد نے لکھا کہ: ''5 فروری 1937ء کو جب میں مچھ جیل سے رہا ہو کر سبی پہنچا تو وہاں ملک عبدالرحیم خواجہ خیل، عبدالکریم شورش، گل خان نصیر، ملک محمد سعید دہوار، ملک فیض محمد یوسف زئی اور دیگر وطن پرست نوجوانوں کی میٹنگ ہوئی جس میں طے ہوا کہ انجمن اتحادِ بلوچاں کے بجائے قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے نام سے ایک نئی تنظیم شروع کی جائے جو انجمن اتحادِ بلوچاں کی جانشین ہو۔ عبدالعزیز کرد صدر، گل خان نائب صدر، اور ملک فیض جنرل سیکرٹری ہوئے۔ عبدالکریم شورش، ملک عبدالرحیم خواجہ خیل اور ملک سعید سینٹرل کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ قلات سٹیٹ پارٹی نے تحریک میں ایک نئی جان ڈال دی اور لیڈر شپ کی راہنمائی میں شورش صاحب پارٹی کے دیگر ساتھیوں کے ساتھ دن رات محنت کر کے پارٹی کو عوام میں مقبول بنا گئے۔''

یہ پارٹی بلوچ ریاست میں قبائلیت کے بجائے ایک متحدہ قوم قائم کرنا چاہتی تھی۔ ریاست میں جمہوری سیاسی اور معاشی اصلاحات کروانا چاہتی تھی اور عوام کے وقار اور توقیر کی بحالی کی جدوجہد کر رہی تھی۔ جلد ہی یہ پارٹی مقبول عام بلوچ آواز بن گئی۔ انگریز اس تحریک اور اس پارٹی سے بہت خوفزدہ ہوگیا۔

جب میر عبدالعزیز کرد نے ملازمت اختیار کرنے کے بعد پارٹی کی صدارت کا عہدہ خالی کیا تو چند مہینوں کے لئے میر شہباز خان نوشیروانی کو قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کا صدر بنایا گیا

۔لیکن پارٹی کے دیگر ارکان ان کی کارکردگی سے مطمئن نہ تھے۔اس لئے ان کی جگہ ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کو صدر بنایا گیا۔میر گُل خان نصیر کو نائب صدر، ملک فیض محمد یوسفزئی کو جنرل سیکرٹری اور بابو عبدالکریم پارٹی کے پبلسٹی سیکرٹری بنے۔

ملک صاحب جنوری1939ء سے لے کر 1947ء تک پارٹی کے صدر رہے۔ان کی شب وروز کی محنت سے پارٹی خوب پھلی پھولی اور اس کی شاخیں، مکران، خاران، چاغی، جھالاوان، بیلہ اور کچھی میں کھل گئیں۔

انہی کی زیرِ صدارت پارٹی نے چھ جولائی 1939ء کو پارٹی کا پہلا سالانہ کنونشن منعقد کیا، اس پس منظر میں کہ اس سے قبل بلوچستان میں جلسہ جلوس کی کوئی روایت موجود نہ تھی۔ تاریخ کا دلچسپ کام دیکھئے: دو جولائی 1939ء کو نوجوان میر غوث بخش بزنجو کراچی سے مستنگ آ رہے تھے۔کوئٹہ سے مستنگ تک وہ شورش صاحب کے ساتھ ہمسفر تھے۔شورش صاحب نے لاری میں بزنجو صاحب سے پوچھا کہ آپ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔انہوں نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ ''میرا نام غوث بخش بزنجو ہے اور میرا تعلق قبیلہ بزنجو' نال جھالاوان کے سردار خیل سے ہے۔کراچی میں زیرِتعلیم ہوں۔ وہاں مجھے اخبارات سے معلوم ہوا کہ قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کا سالانہ اجلاس مستنگ میں ہو رہا ہے لہٰذا میں جلسے کے لئے آ رہا ہوں۔''

مستنگ پہنچتے ہی شورش صاحب بزنجو کو اجلاس میں لے گئے اور شرکا سے ان کا تعارف کرایا۔سب اس نوجوان کو دیکھ کر خوش ہوئے۔

ایک عالیشان انتظام کے ساتھ جہاں خوراک و رہائش کا انتظام مقامی مستنگ شاخ نے کر رکھا تھا، یہ کنونشن منعقد ہوا۔ بزنجو صاحب سیاسی افق پر یہیں سے نمودار ہوئے۔ملک صاحب نے اپنی صدارتی تقریر کی، باچا خان، عطاءاللہ شاہ بخاری اور عبدالصمد اچکزئی کے پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔

دوسرے دن کی کارروائی شروع ہوئی مگر انگریز اور سرداروں نے مل کر قبائلی فساد کے ذریعے اسے نہ ہونے دینے کی سازش کی۔ مسلح قبائلی سرداروں نے جلسے پر حملہ کیا جس میں شورش بابو تصویریں لیتے ہوئے زخمی ہو گئے۔سرداروں اور انگریزوں کی خواہش تھی کہ اس طرح ایک خون

خرابہ کر کے اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کر لیں گے۔مگر پارٹی نے اپنے لوگوں کو بھی مسلح دیکھ کر، اور بڑے پیمانے پر خون ریزی کا اندازہ کر کے پارٹی کا دوسرا سیشن ہی ختم کر دیا۔اس طرح قتل وقتال کا انگریزوں کا بنایا ہوا منصوبہ ناکام ہوا۔

جن سرداروں نے پارٹی جلسہ پر حملہ کر دیا تھا، وہ پارٹی ممبروں کے خلاف خان قلات کے پاس گئے اور مطالبہ کیا کہ ملک عبدالرحیم، مرزا فیض اللہ، میر فاضل خان کو ملازمتوں سے علیحدہ کیا جائے۔عبدالکریم شورش، مولانا عرض محمد، مولانا محمد عمر کو ریاست بدر کیا جائے۔ چنانچہ سرداروں کی فرمائش پر من وعن عمل ہوا............اور سارے راہنماؤں کو تاحکم ثانی ریاست بدر کیا گیا۔ بابو نے 1939ء میں ہی سٹیٹ نیشنل پارٹی کی ہمدردی میں ریاست قلات کے اپنے سرکاری عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

بعد میں پارٹی کا آل انڈیا پیپلز کانفرنس کے ساتھ الحاق ہو گیا اور ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کی سربراہی میں قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کا نمائندہ وفد جس میں میر غوث بخش بزنجو، ملک فیض محمد یوسف زئی، اور میر گل خان نصیر شامل تھے انڈیا گیا اور وہاں نہرو اور دیگر چوٹی کے راہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور کانفرنس میں شرکت کی۔اور اسی دوران پنڈت جواہر لال نہرو نے ملک صاحب کو نیشنل کانفرنس کی جانب سے شیخ عبداللہ کی ڈوگرہ راج کے خلاف کشمیر چھوڑ دو کی تحریک کا جائزہ لینے بھیج دیا۔ملک صاحب امرتسر اور لاہور آئے یہاں تحریک کے بارے میں حالات کا جائزہ پیش کیا۔

پاکستان بننے کے بعد ملک صاحب ناظم قلات کے عہدہ پر فائز ہوئے اور مئی 1948ء تک اسی عہدہ پر کام کرتے رہے۔بعد میں اپنے عہدے سے استعفیٰ دے کر اپنا ذاتی کاروبار شروع کیا جو کہ ان کی وفات تک جاری رہا۔

1946ء میں جا کر اُن کی جلاوطنی ختم ہوئی اور ملک عبدالرحیم اپنے ساتھیوں سمیت دوبارہ مستنگ داخل ہو سکے۔پارٹی منظّم ہوئی اور زبردست اصلاحات کے مطالبے کے نتیجے میں احمد یار خان نے ریاست میں دو ایوان قائم کیے۔ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کی قیادت میں پارٹی نے 52 نشستوں کے ایوان میں 39 سیٹیں جیت لیں۔گیارہ اگست 1947ء کو قلات آزاد ہوا اور اس میں

پارٹی کے مطالبہ پر اصلاحات کی گئیں۔ پارٹی صدر ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کو ناظم الحکومت ریاست قلات بنا دیا گیا اور دوسرے عہدیداروں کو بھی ریاست کے نظم و نسق میں لیا گیا۔ مئی 1948ء میں ملک صاحب نے ریاستی عہدے سے استعفےٰ دے دیا۔

یوں وہ 1938ء سے لے کر 1948ء تک کے پر آشوب دور میں قلات سٹیٹ نیشنل پارٹی کے صدر رہے۔

ملک صاحب 21 اکتوبر 1965ء کو مشن ہسپتال کوئٹہ میں فوت ہوئے۔ اور مستنگ میں مدفون ہوئے۔(1)

حوالہ جات

1۔ شہیک کریم۔ ہزار گنجی میں کچی قبر کا پس منظر۔ غیر مطبوعہ مضمون

قاضی داد محمد

(1895۔۔۔۔9 ستمبر 1951)

اس موڑ پر بابو کی سیاسی جدوجہد ایک اور بڑے انسان کی جدوجہد میں شامل ہو جاتی ہے۔ یہ بڑا انسان اپنی پختہ کمٹ منٹ، متحرک و سرگرم میلان اور شاندار جدوجہد سے سیاسی قائد بن جاتا ہے۔ یہ تھے سبی کے قاضی داد محمد۔ ہم اُن کی سوانح کے ساتھ ساتھ اس جدوجہد کا بھی تذکرہ کریں گے جو دراصل بابو شورش اور قاضی داد محمد کی مشترک جدوجہد تھی۔

قاضی داد محمد سبی میں کڑک کے مقام پر 1895ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام قاضی عرض محمد تھا اور وہ علی زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ سبی کے قاضی خیل خاندان میں سے تھے۔ اس خاندان کا دعویٰ ہے کہ وہ بادشاہ التمش کے زمانے میں (جب سبی اُس بادشاہ کے تحت تھا) سیوی کے داروغہ تھے۔

کڑک بلوچستان بھر کی جاگیروں میں انتہائی ظالمانہ اور بے رحمانہ جاگیر تھا۔ یہاں رجعت پسند اور جابر جاگیرداروں کی آنکھوں میں رعونت اور نخوت کی بجلیاں کوندتی تھیں۔ اور جاگیردارانہ استحصال کے ستاتے ہوئے کسان اور چھوٹے زمیندار، طبقاتی نفرت اور حقارت کی بھٹی میں جل رہے تھے۔ اس ماحول میں قاضی داد محمد پیدا ہوا، پلا اور جوان ہوا۔

قاضی صاحب نے ابتدائی تعلیم مدرسہ کڑک سے حاصل کی۔ پرائمری پاس کرنے کے بعد انہوں نے مڈل سکول سبی سے مڈل پاس کیا اور دینی تعلیم درسِ نظامی تک حاصل کی۔ انہوں نے 1926ء میں ملازمت چھوڑ دی اور عملی سیاست میں سرگرم حصہ لینا شروع کر دیا۔ آیئے ایک عدالتی فیصلہ یہاں نقل کر کے قاضی داد محمد کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں:

قاضی داد محمد اور ایک عدالتی فیصلہ (19-10-1927)

حکم آفیسر / فیصلہ: سرکار بذریعہ سپرنٹنڈنٹ جیل ضلع سبی

مورخہ 1-10-27 کو اس نے مطالبات کی عدم منظوری کی بنا پر جیل میں بھوک ہڑتال کر دی۔ (مطالبات یہ تھے):

1- میں سیاسی قیدی ہوں۔ توہینِ عدالت کے جرم میں سزا یافتہ ہوں۔ مجھے جیل میں اس کی مطابقت میں اے، بی یا سی کلاس میں رکھا جائے۔

2- جیل وارڈنوں میں مقامی لوگوں کو بھرتی کیا جائے۔

3- خشک سالی کی وجہ سے تلی اور مل کے کاشتکار بہت تنگدستی کا شکار ہیں۔ ان کی امداد کی جائے۔

4- بمثلِ نصیر آباد، یہاں سیوی میں بھی ریلیف ایکٹ دکن جاری کیا جائے اور کاشتکاروں کی مدد کی جائے۔

5- ملکی کلرکوں سے امتحان سے متعلق تمام پابندیاں ہٹا دی جائیں اور ان سے دوبارہ امتحان نہ لیا جائے۔

6- کالے قوانین کو ختم کیا جائے۔ بیگار ختم کی جائے، تعلیم عام کی جائے، روزگار کے مواقع فراہم کیے جائیں اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کر کے جوابدہ حکومت قائم کی جائے۔

سات تاریخ تک قاضی صاحب کی بھوک ہڑتال جاری رہی۔ اُس روز انہیں دھمکی دی گئی کہ انہیں زبردستی گلوکوز والا پانی پلایا جائے گا۔ قاضی صاحب نے ان کی دھمکی پر پانی اور دودھ وغیرہ پی لیا اور اس کے بعد پھر ہڑتال کر دی۔ سرکار نے انہیں بھوک ہڑتال کے جرم میں چھ ماہ کی

جیل دے دی۔(1)

قاضی صاحب بلوچستان کی ہماری مزدور تحریک کے گمنام سپاہی ہیں۔ سوشلزم کے لئے سب سے پہلی آواز اور منظّم نعرہ انہوں نے ہی لگایا تھا۔ انہوں نے ترقی پسند اور سامراج دشمن سیاست 1929ء میں شروع کی اور حکیم پنوں خان کے ساتھ کسان تحریک کے روح رواں بنے۔ انہوں نے کوئٹہ اور مچھ میں کوئلہ کانوں اور ریلوے مزدوروں کو منظّم کر کے ان کی سیاسی، معاشی اور طبقاتی حقوق کے حصول میں اپنی جدوجہد مرکوز کی۔

قاضی محمد یعقوب کی توسط سے ہمیں 1932ء کی ایک پرانی دستاویز ملی ہے جو کہ کل ہند بلوچ کانفرنس جیکب آباد سے متعلق ہے۔ جگہ جگہ سے دھندلایا گیا یہ مسودہ جہاں تک ہم سے پڑھا گیا' یوں ہے:

"Office of the Secretary,

All India Baloch Conference

Jacob Abad

Urgent

''مکرم محترم جناب برادرم قاضی داد محمد صاحب

اسلام علیکم!

''عرض کہ جناب کو............کمیٹی آل انڈیا بلوچ کانفرنس کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے............آپ جناب پہلی ٹرین سے روانہ ہو کر جیکب آباد تشریف لائیں اور شرف شمولیت فرمائیں۔

''آپ کے یہاں کے قیام............

''اہم سوالات............یوسف صاحب کو بھی تار دیا گیا ہے، امید قوی ہے کہ جناب بھی آج یا کل آویں گے۔ تاکید۔

''اجلاس کی تاریخ آپ کی آمد پر موقوف ہے۔

20-10-32

غلام سرور خان، سیکرٹری آل انڈیا بلوچ کانفرنس

جیکب آباد

دستخط انگریزی

آپ صاحبان اس بارے میں ضرور تشریف لاویں۔ ورنہ بہتر نہ ہوگا۔

سرور''

(کیا بے تکلفی ہے، کیا دھمکی ہے۔ ایسی قربت ہو تو ساتھ کا کتنا مزہ آ جائے!)۔

1935ء کے زلزلے میں قاضی صاحب نے رضا کار بن کر زلزلہ زدگان کی مدد کی اور اپنے محبوب ساتھی یوسف عزیز مگسی کی وفات کے سوگ میں چھ ماہ تک کپڑے نہ بدلے اور نہ حجامت بنائی۔ کپڑے تن پر تار تار ہو گئے تھے۔(2) اس جنون کے صدقے، اس وارفتگی پر قربان!!

تاریخ دلچسپیوں سے بھری پڑی ہے اور اس میں بہت دلچسپ مظاہر موجود ہیں۔ 1948ء میں بلوچستان لیبر فیڈریشن (جو کہ مسلم لیگ کا ایک ونگ ہوا کرتی تھی) نے سبی میلہ کے موقع پر ایک جلسۂ عام کا بندوبست کیا تھا۔ اس جلسے سے ایک دن قبل قاضی داد محمد نے بلوچستان لیبر فیڈریشن کے صدر سید میر احمد شاہ آغا سے مطالبہ کیا کہ مقررین میں ان کا نام بھی شامل کیا جائے۔ آغا نے نظریات کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ قاضی نے جلسہ کو درہم برہم کرنے کی دھمکی دی۔ رات کو جلسہ والوں نے اُن کے مکان کے دروازے پر تالا لگا دیا۔ قاضی صاحب گھر کے اندر بند کر دیے گئے اور جلسے کے خاتمے پر ہی جا کر انہیں رہائی نصیب ہوئی۔ چنانچہ آدھی رات سے صبح تک وہ سبی کی سڑکوں پر بلوچستان لیبر فیڈریشن کے خلاف نعرے لگاتے رہے۔ اور بعد میں ریذیڈنسی کے دروازے پر پہنچے جہاں پاکستان کے گورنر جنرل قائد اعظم قیام پذیر تھے۔ صبح سویرے، وہ قائد اعظم سے ملاقات کرنے پر بضد تھے اور زور زور سے چلا رہے تھے۔ اس پر گیٹ پر موجود پولیس آفیسر نے قاضی صاحب کو پاگلوں کے قانون کے تحت گرفتار کر لیا۔(3)

ان کی جیل بھی دلچسپ ہوا کرتی تھی۔ وہاں وہ انگریز قوانین کی خلاف ورزی کی غرض سے پانچ وقت اذان دیا کرتے تھے۔ اس جرم میں انہیں قید تنہائی میں ڈالا گیا۔ مگر وہ وہاں بھی زور

زور سے اذان دیتے رہتے۔

قاضی داد محمد کے خاندان کا شمار سبی کے معزز خاندان میں ہوتا تھا۔ آپ مزدور تحریک کے روح رواں تھے۔ انہوں نے ''بلوچستان مزدور یونین'' کے نام سے ایک انجمن کی داغ بیل ڈالی۔ سبی و کوئٹہ میں لیبر یونین کا دفتر قائم کر کے اس پر مزدوروں کا سرخ پرچم لہرایا۔

اسی زمانے میں ریلوے کے مزدوروں نے اپنے مطالبات منوانے کے لئے پہیہ جام ہڑتال کی تھی۔ قاضی صاحب نے سبی ریلوے مزدوروں کے ساتھ مل کر اُن کی رہبری کر کے ہڑتال کو کامیاب بنایا۔ قاضی صاحب اپنے رفقا سمیت ریلوے مزدور ساتھیوں کے رہنماؤں چراغ دین، بشیر احمد، بلدیو سنگھ اور موہن لال کے ساتھ ریلوے پٹڑی پر لیٹ گئے اور مزدوروں کا انقلابی سرخ جھنڈا جس پر درانتی اور ہتھوڑے کا نشان تھا، اپنے سینے پر کھڑا کر کے ہوا میں لہراتے رہے اور دیگر تمام ریلوے کے ہڑتالی مزدور گاڑی کے پہیوں کے ساتھ چمٹ گئے اور ہڑتال مقررہ وقت تک جاری رہی۔ انگریز سامراج نے ان کو ہر طرح سے خوفزدہ کرنے اور ہڑتال سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن کوئی حربہ کارگر نہ ہوا۔ اس دوران گاڑیوں کی آمد و رفت معطل ہو جانے کی وجہ سے کافی لوگ ریلوے سٹیشن سبی میں موجود تھے۔ اور یہ موقع تھا بھی سبی کے مشہورِ زمانہ 'سالانہ جلسہ' کا۔'' میں نے بہ چشم خود دیکھا کہ سبی سٹیشن پر پلیٹ فارم نمبر 1 اور نمبر 2 کے درمیان جو پُل بنا ہوا ہے اُس پُل پر شہزادہ آغا عبدالکریم خان احمد زئی، نواب اسد اللہ خان رئیسانی اور نواب بہرام خان لہڑی (وزیر عدلیہ ریاست قلات) موجود تھے۔ اور پلیٹ فارم پر اے آر ڈیوی APA سبی اور سردار مراد خان سارنگ بھی موجود تھے۔ اور اُن کے ساتھ سید شہین خان شاہ شاہرگ والے بھی موجود تھے۔ لیکن علاقہ مجسٹریٹ خان عبداللہ خان جو اُن دنوں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر سبی تھے، موجود نہ تھے۔ اس لئے پولیس مداخلت نہ کر سکی۔ علاقہ مجسٹریٹ اُس وقت آئے جب ہڑتال کا مقررہ وقت ختم ہو چکا تھا۔ اس کامیاب ہڑتال کے بعد قاضی صاحب کو بمع اُن کے چار ساتھیوں کے گرفتار کر کے ڈسٹرکٹ جیل سبی میں رکھا گیا۔ لیکن ریلوے مزدوروں اور سبی شہر کے عوام نے ہڑتال کر کے شہر بند کر دیا۔ بلکہ دیہات کے لوگ بھی ہڑتال میں شامل ہو گئے۔ اور سب لوگ ڈسٹرکٹ جیل سبی کے سامنے جمع

ہو گئے جو نعرے لگا رہے تھے؛ ’’دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ‘‘، ’’نوکر شاہی کو جھکا دو‘‘، ’’انقلاب زندہ باد‘‘۔ انتظامیہ نے مجبور ہو کر تیسرے دن قاضی داد محمد اور اُن کے چار ساتھیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔

اُس زمانے میں شہری سیاست کو بہت کم لوگ جانتے تھے اور نہ کوئی اپنے حقوق کو جانتا تھا ۔لیکن قاضی صاحب نے نا قابلِ برداشت قربانیاں دے کر اس خطہ کے لوگوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کا شعور دیا۔ سبی میں اُس زمانے میں تین سیاسی پارٹیاں کام کر رہی تھیں۔

اول: مزدور پارٹی جس کی قیادت قاضی داد محمد کر رہے تھے۔

دوم: خاکسار پارٹی جس کی قیادت شیخ عبدالعزیز گھڑی ساز کر رہے تھے اور

سوم: مسلم لیگ تھی جس کی قیادت قاضی غلام رسول علی زئی اور حکیم پنہوں خان کر رہے تھے۔‘‘(4)

اس بے سرو سامان اور بے نوا انسان نے انتہائی نا مساعد حالات میں شعوری پختگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی پہلی اور غیر اعلان شدہ کسان تحریک کا آغاز بھی اسی جاگیرداری کے گڑھ، کڑک سے کیا۔

قاضی صاحب نے بلوچستان میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک درویشانہ سفر کیے۔ وہ بجا طور پر یوسف عزیز مگسی کی رفاقت کے حقدار ہوئے۔

زندگی کے دوسرے اور آخری مرحلہ میں اسے مزدور کے تلخ اوقات کا احساس ہوا اور یوں یہ شخص مزدور کسان لیڈر بن کر، بلوچستان گیر حیثیت کا حیدر بخش جتوئی بن گیا اور قید و بند کی تکالیف برداشت کیں۔

وہ اسی طبقے کی نمائندگی کرتے ہوئے جیل گئے، ریل کے سامنے لیٹے، مگر اُف تک نہ کی ۔ دوسروں کے سامنے چندے کے لئے ہاتھ نہ پھیلائے۔ اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر جو کچھ پس انداز کیا، اسے بھی ملک و قوم کی عظمت پر قربان کر دیا۔

مزدور تحریک کے لیڈر قاضی داد محمد چھ چھ ماہ یا کبھی سال تک گھر نہ آتے تھے، کسی کو خبر نہ

ہوتی کہ کہاں پر ہیں۔

ایک بار سبی کے ریلوے مزدوروں کو تنخواہوں کی ادائیگی نہیں ہو رہی تھی۔ اس پر قاضی صاحب جا کر ریلوے لائن پر سو گئے۔ بزنجو آئے مزدوروں اور قاضی صاحب کی نمائندگی کر کے حکومت سے مذاکرات کرا کر ادائیگی کروائی اور قاضی صاحب رہا ہو گئے۔(5)

انگریزوں کے دور میں بزنجو صاحب نے کہا کہ مزدوروں کی طرف سے ریلوے ہڑتال قاضی صاحب کی راہنمائی میں ہوئی تھی اور وہ گرفتار ہوئے تھے۔ اس سلسلے کے احتجاج میں عوام کے ساتھ خود بزنجو صاحب بھی شامل ہوئے تھے۔(6)

1940ء میں سبی میں ایک مسجد کے ساتھ ’’یوسف عزیز مزدور لائبریری‘‘ قائم کی جس میں مشہور اخبارات باقاعدگی سے آتے تھے۔(7) بہت قدیم شہر سیوی میں، یوسف مزدور لائبریری اور اس پر درانتی ہتھوڑے سے مزین سرخ پرچم، اس کی عظمت اور درویشی کے مظاہر تھے۔(8) آپ انجمن اسلامیہ سبی کے سیکرٹری بھی رہے۔

واضح رہے کہ اپریل 1941ء میں انہوں نے بلوچستان مزدور پارٹی قائم کر دی۔ ایک پندرہ رکنی پارٹی کے وہ خود صدر تھے۔ یہ دراصل بلوچستان کی کمیونسٹ پارٹی تھی۔ جس کے زیر اہتمام بلوچستان کی تاریخ میں یوم مئی کا اولین جلسہ میکموہن پارک میں منعقد ہوا۔ چونکہ یہ جلسہ کسی فروعی، سطحی اور بچگانہ بات پر منعقد نہ ہوا تھا بلکہ یہ جلسہ سماجی تبدیلی لانے، انسانی حیات کو باعمل، بامقصد اور بامراد بنانے اور طبقاتی استحصال کو مٹانے جیسے بنیادی موڑ مڑنے کا اجتماع تھا لہٰذا قاضی داد محمد، محمد اقبال (جنرل سیکرٹری)، ہوتو رام اور سید محمد کاسی گرفتار کر لئے گئے اور ہمارے ان اکابرین کو ایک ایک سال قید سخت دی گئی۔ اور بلوچستان مزدور پارٹی کے چھ کارکن وطن (بلوچستان) بدر کر دیے گئے۔

قاضی صاحب نے اپنی سزا پوری کاٹ لی تو رہا ہو کر پھر اپنے سیاسی کام میں جت گئے۔ پارٹی کو منظم کیا، احباب کو ایجوکیٹ کیا اور ممتاز انسانوں کا یہ قابل احترام گروہ اپنے مشن میں بغیر دائیں بائیں متوجہ ہوئے مستقل مزاجی سے لگا رہا۔ بابو عبدالکریم شورش اس مردِ مومن کے قبیل میں سے تھے۔

قاضی داد محمد اگست 1948ء میں بیمار ہوئے۔ مرض الموت کے دوران سول ہسپتال کوئٹہ میں اپنے دوستوں کو وصیت کی کہ ''مرنے کے بعد انہیں بلوچستان کے مردِ قلندر میر یوسف علی خان عزیز مگسی کے پہلو میں دفن کیا جائے۔''(9) 9 ستمبر 1951ء میں سول ہسپتال کوئٹہ میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ میر یوسف عزیز مگسی کی طرح وہ بھی کاسی قبرستان میں دفن ہیں۔ اور مگسی صاحب ہی کی طرح ان کی قبر پر بھی پھول چڑھانے کوئی نہیں جاتا۔

ان کے بیٹے قاضی محمد یعقوب نے ہمیں بتایا کہ ان کی کوئی تصویر دستیاب نہیں ہے۔

حوالہ جات

1- علی زئی، محمد یعقوب۔ قاضی داد محمد اور ایک عدالتی فیصلہ۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔ نومبر 1993۔ صفحہ 17

2- علی زئی، محمد یعقوب، قاضی داد محمد۔ ماہنامہ سنگت جنوری 2000۔ صفحہ 9

3- خدائیداد، ڈاکٹر۔ بلوچستان میں محنت کش تحریک کا آغاز۔ ماہنامہ نوکیں دور۔ جون 1994۔ صفحہ 22

4- رند، عظمت خان۔ قاضی داد محمد۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔ فروری 2000 صفحہ 36۔

5- باروزئی، سردار محمد خان۔ قاضی داد محمد علی زئی۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔ مارچ 2000۔ صفحہ 47

6- کوثر، انعام الحق، بلوچستان میں اردو۔ صفحہ 240

7- ماہنامہ بلوچی دنیا۔ ملتان۔ اپریل 1989۔ صفحہ نمبر 2

8- قاضی، عرض محمد۔ ماہنامہ سنگت۔ دسمبر 2003۔ صفحہ نمبر 95

9- کوثر، انعام الحق۔ بلوچستان میں اردو۔ صفحہ 518

دوسری عالمی جنگ اور بابو

دوسری عالمی جنگ چھڑ جانے کے بعد انگریز نے ریاست کلات پر اپنی گرفت سخت کر دی۔ اس نے مستاجر علاقوں کو واپس کرنے کے بجائے الٹا جیونی پر قبضہ کر لیا۔ اس پر قلات نیشنل پارٹی نے سخت احتجاج کیا۔ ہینڈ بل شائع کیے گئے اور بلوچوں کو انگریز کے عزائم سے باشعور کرنے کے لئے پارٹی کے رہنماؤں نے پوری ریاست کا دورہ کیا۔ انگریز نے پارٹی پر پابندی لگا دی اور اس کے عہدیداروں کو ریاست بدر کر دیا جن میں بابو بھی شامل تھے۔ بابو نے ریاست کی صورتحال پر ہندوستان کے بڑے بڑے اخبارات کو مضامین لکھ بھیجے۔

شورش، عالمی امن کمیٹی کے ممبر تھے اور بلوچستان میں اس کے سب سے زیادہ سرگرم رکن تھے۔ سیف الدین کچلو اس زمانے میں اس کے صدر تھے۔(1)

اسی دوران ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ سوویت یونین تو ایک عالمگیر سوچ کا سمبل تھا اور مزدوروں کی حاکمیت کا وطن تھا۔ یہ محنت کشوں کے آدرشوں کی تکمیل تھا۔ دنیا بھر کے بھوکوں، غلاموں اور زیردستوں کا دوسرا مادرِ وطن سوویت یونین تھا۔ لہٰذا پوری دنیا میں مظلوم انسانوں اور ان کی تنظیموں بالخصوص کمیونسٹ پارٹیوں نے اس ''سامراجی'' جنگ کو مزدوروں کے دیس پر حملہ کے بعد ''عوامی'' جنگ قرار دیا۔ اور ہٹلر کے خلاف اس جنگ میں شامل ہو کر سوویت یونین کو تباہی

سے بچانا ہر جمہوریت دوست کا فریضہ ٹھہرا۔

اس بین الاقوامی فریضہ کی بجا آوری بلوچ وطن میں عبدالکریم اور اُن کے ساتھیوں کے علاوہ اور کون کرسکتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے 22 جولائی 1941ء میں میکموہن پارک میں جلسہ کیا۔ یہ جلسہ فاشزم کے خلاف اور سوویت یونین کے حق میں تھا۔ چونکہ اس جنگ میں انگریز سوویت یونین کے اتحادی تھے لہٰذا مقررین نے اپنی سرزمین کی آزادی کی جنگ کو وقتی طور پر ملتوی رکھ کر عوام الناس کی رائے کو ہٹلر کے خلاف ہموار کرنا شروع کیا۔ گاندھی جی نے پالیسی کی اس تبدیلی پر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کو غدار اور انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیا تھا۔ یہاں بلوچستان میں اس جلسہ کے بعد گاندھی جی کے ساتھی خان عبدالصمد خان اچکزئی نے بلوچستان میں انڈین کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ ساتھ عبدالکریم پر بھی ''انگریز ایجنٹ کا لیبل چسپاں کردیا''۔(2)

مگر بابو رہے دھن کے پکے۔ وہ اس کے باوجود خان شہید سے دوستی نبھاتے رہے۔ مگر اپنے نظریات پر کبھی سمجھوتہ نہ کیا۔

بابو اور اس کے ساتھیوں کو طعنے، دھتکار اور طنز سب قبول، سب گوارا! بس لگے رہے اپنے فرض کی ادائیگی میں۔ وہ بلوچستان میں کمیونزم کا کھمبا اور سب سے بڑے کھڑپینچ تھے۔ کوئی ساتھ دے کہ نہ ساتھ دے، بابو اپنا مشن جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ سوشلسٹ اخبارات اور پمفلٹ تقسیم کرتے تھے۔ وہ چلتے پھرتے مجسم ''سوشلزم'' تھے۔ زبردست ''بحث چی'' تھے۔ بڑھ چڑھ کر دلائل لاتے اور اپنے موقف کی وضاحت کرتے۔ مگر وہ شائستگی چاہتے تھے۔ اپنے پارٹی اکابرین اور تحریک کے خلاف نازیبا تاثرات انہیں قطعاً گوارا نہ تھے۔ انہوں نے اپنے قریبی دوست محمد یوسف غلزئی کو 1941ء میں اُس وقت تھپڑ مار دیا جب انہوں نے سٹالن کے بارے میں ایسے الفاظ کہے جن سے بابو کے جذبات مجروح ہوئے تھے۔(3) غلزئی صاحب نے تھپڑ کا جواب تھپڑ سے نہ دیا بلکہ ہنس دیے...... بڑے انسانوں کی بڑی باتیں۔ غلزئی کی اس جوابی کارروائی کو سلام ہو!!

بابو نے حکومت کو ایک اردو ہفت روزہ جاری کرنے کی اجازت کیلئے درخواست دے

دی۔ اس مجوزہ اخبار کا نام انہوں نے ''تعمیرِ نو'' تجویز کیا تھا۔ حکومتِ ہند نے ان کی درخواست مسترد کی۔ الفاظ دیکھئے:

No.301-PC(632)/45.

Government of India.

Department of Industries and Civil Supplies.

New Dehli, the 26th September,1945

From: D.S. Penegal,Esquire,
Assistant Secretary
to the government of India.

To: Abdul Karim Shorish
C/O
Baluchistan National
Bazar Sarafa, Quetta (Balochistan)

Sir,

With refrence to your letter, dated the 8th September,1945, I am directed to say that the Government of India have carefully considered your request for permission to start publication of an Urdu weekly under the name of "Tamir-i-Nao" but regret that they are unable to accede to it.

I have the honour to be,

Sir,

your most obedient Servant,

Sd.xxxxxxxxx

FOR ASSISTANT SECRETARY TO THE GOVERNMENT OF INDIA.

1941ء میں جناب شورش صاحب نے قاضی داد محمد کے ساتھ مل کر بلوچستان مزدور پارٹی قائم کی۔ قاضی داد محمد اس کے صدر اور شورش صاحب جنرل سیکرٹری منتخب ہو گئے۔ پارٹی نے دنیا کے مزدوروں کے عالمی دن کے موقع پر کوئٹہ میں ایک جلسہ منعقد کرایا اور انگریز نے قاضی داد محمد کو گرفتار کر لیا۔ شورش بچ گئے۔

اولین یوم مئی جلسہ کی صدارت ملک سید محمد خان نے کی۔ بابو نے بلوچستان مزدور پارٹی کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے ایک انقلاب آفریں رپورٹ پیش کی۔ ممتاز ادیب و شاعر اور ہمارے دوست سرور جاوید کے محترم والد کامریڈ محمد شفیع اسدی نے اقبال کی نظم ''لینن خدا کے حضور'' ترنم کے ساتھ سنائی جبکہ سردار گربچن سنگھ نے مزدوروں کے بارے میں ایک پنجابی نظم پڑھی۔ سردار جیت سنگھ نے مچھ کی کوئلہ کانوں کے مزدوروں کے مسائل پیش کیے جس کے بعد محمد حسین عنقا نے یوم مئی پر ایک مدلل تقریر کرتے ہوئے شکاگو کے جیالے اور عظیم شہیدوں کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ جنہوں نے اپنی بیش بہا قربانیوں کی بدولت دنیا سے محنت کشوں کی عظمت کا لوہا منوایا۔

ہم یہاں اس مضمون کے اقتباسات پیش کریں گے جو ماہنامہ نوکیں دور'' 1990ء کے شمارہ نمبر 12 میں (8 مئی 1942ء کے بولان نامی رسالے سے لیا گیا تھا) چھپا تھا؛

''بلوچستان مزدور پارٹی کا جلسہ

''کوئٹہ یکم مئی؛ آج (1942ء) رات کو ساڑھے آٹھ بجے میکموھن پارک میں بلوچستان مزدور پارٹی نے یوم مئی منایا۔ ایک ہزار سے اوپر جلسے میں حاضرین کی تعداد تھی۔ ملک سید محمد شفیع اسدی نے اقبال کی نظم ''لینن'' ترنم سے سنائی۔ اس کے بعد پارٹی کے جنرل سیکرٹری کامریڈ عبدالکریم شورش نے رپورٹ پڑھی۔ سردار گربچن سنگھ نے ایک پنجابی نظم پڑھی جو مزدوروں کے بارے میں تھی۔

''اس کے بعد محمد حسین عنقا نے ''یوم مئی'' پر ایک طویل تقریر کی اور بتایا کہ دنیا میں پہلی بار اسی دن مزدوروں نے اپنی تنظیم کی بنیاد رکھی' جتھ بندی کی جانب قدم اٹھایا۔ روس کے مزدوروں

اور کسانوں نے خود کو دنیا میں سب سے زیادہ منظّم کیا اور اس قابل ہوئے کہ اپنے ملک کی سرمایہ دارانہ حکومت کو ختم کریں۔ بیس سال کے عرصہ میں انہوں نے کامریڈ سٹالن کی راہنمائی میں نہ صرف ہندوستان جیسے ملک' روس میں سے اس کی جہالت، جاہلانہ رسم و رواج' بھوک اور بیروزگاری ہی دور نہ کی بلکہ اس کی صنعت، زراعت، تجارت اور سیاسی و فوجی حالت کو اس قدر ترقی دلائی کہ ہٹلر کی ناقابل شکست فوج ایک سال سے تمام یورپ کی فاشسٹ طاقت کو لے کر اپنا پورا پورا زور لگا رہی ہے لیکن بے سود۔ آج روس فولاد کی مانند متحد اور مضبوط ہے۔ ہٹلر ہزار پروپیگنڈہ کرتا رہا کہ روس میں پھوٹ ہے لیکن ایک سال سے اپنی اتنی بڑی طاقت اور لالچ کے باوجود ایجنٹ اپنے لئے روس کی سرزمین سے پیدا نہیں کر سکا۔ یہ روس کے اس نظام کی برکت ہے جسے رحمت کہا جا سکتا ہے۔ یوم مئی کا آپ مزدروں سے یہی تقاضا ہے کہ آپ بھی اپنی تنظیم کر کے اس رحمت کو قائم رکھنے اور اپنے ملک میں اس رحمت کو قائم کرنے کی پوری کوشش کریں۔ انقلاب زندہ باد۔ سٹالن زندہ باد۔ سرخ فوج زندہ باد۔

''اس کے بعد میر غوث بخش بزنجو نے پارٹی کی بنیادی پالیسی کا ریزولیوشن پیش کیا۔ بزنجو اس ریزولیوشن پر آدھ گھنٹہ برابر بولتے رہے۔ آپ کی تقریر سے تمام پبلک میں جوش پھیل گیا۔ مزدوروں نے بارہا تالیوں اور نعروں سے آپ کی تقریر کو سراہا۔ تقریر ریزولیوشن کی وضاحت اور ضرورت کو اتنی روشن کر گئی کہ پبلک نے جوش سے ریزولیوشن منظور کی۔ ریزولیوشن کی تائید محمد حسین عنقا نے کی اور مزید وضاحت وضروری مثالوں اور نظموں کے ساتھ کی۔

''اس کے بعد شمیم صاحب نے مزدوروں کے لئے مہنگائی الاؤنس کا ریزولیوشن پیش کرتے ہوئے دردناک لہجے میں اس پر مختصر تقریر کی۔ کامریڈ شورش نے اس کی تائید کی۔ ریزولیوشن پاس ہوا۔

''سردار جیت سنگھ نے مچھ کی کوئلہ کانوں کے مزدوروں کی اجرت بڑھانے اور ان کی صحت و جان کی ضروری نگہداشت کرانے کے سلسلے میں ریزولیوشن پیش کیا اور ان واقعات پر مبنی دردناک تقریر کی۔ محمد حسن نظامی نے ریزولیوشن کی تائید کی۔ سردار جیت سنگھ سے مزدوروں نے بڑا اثر

قبول کیا اور تالیوں اور نعروں کے ساتھ آپ کا ریزولیوشن پاس کیا۔ اس کے بعد کامریڈ اسدی نے ایک نظم ترنم سے پڑھی۔ صدر نے اخیر میں ''والنٹیئر کور'' بنانے کے لئے شہریوں سے تعاون کرنے کی اپیل کی اور جلسہ برخاست کیا۔

پہلا ریزولیوشن:

''بلوچستان مزدور پارٹی کے اس جلسے کی رائے ہے کہ:

"الف:

نازی جرمنی کی زیر قیادت جنگ کی نوعیت اس دن سے زیادہ واضح ہوگئی ہے جس دن سے کہ اینٹی کومنٹرن پیکٹ کے تمام مقتدر عناصر نے تشدد اور خونریزی کے ذریعہ دنیا میں راج قائم کرنے کے لئے ہٹلر کی علمبرداری میں متحدہ طور پر دنیا کی پچانوے فیصد آبادی یعنی محنت کش طبقہ کے واحد قلعہ سوویت یونین پر نان ایگریشن پیکٹ کے ہوتے ہوئے غدارانہ حملہ کرکے ہٹلر کی زبان سے اعلان کیا کہ بالشویزم یعنی محنت کش طبقہ کا فطری حق موجودہ سرمایہ دارانہ معیار زندگی کے لئے چونکہ خطرناک ہے اس لئے اس کو دنیا کے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے 22 جون 1941ء سے یہ مہم شروع کی گئی۔ عین اس وقت جبکہ کامریڈ سٹالن نے اپنے اتحادیوں سے یورپ میں ایک دوسرا محاذ کھولنے کی اپیل کی کہ نازی جرمنی کو سوویت یونین کی سرخ فوج نے شکست دینا اور پیچھے ہٹانا شروع کیا تو اینٹی کومنٹرن پیکٹ کے ایشیائی ممبر جاپان نے سوویت یونین کے اتحادیوں پر دھاوا بول دیا تاکہ اتحادی مشرق بعید کی اسی جنگ میں اس قدر مصروف ہوجائیں کہ وہ سوویت یونین کو کسی قسم کی امداد نہ دے سکیں۔ آج جبکہ یورپ کے ترقی پسند عوام نے اندرونی طور پر اور مزدوروں اور کسانوں کی سرخ فوج نے میدانِ جنگ میں اس کی جڑیں کھوکھلی کردی ہیں، ایسے وقت میں فرانس کے غدار لاول اور سپین کے دشمن فرانکو نے نازی جرمنی کی جڑوں کو دوبارہ مضبوط کرنے کے لئے کھلم کھلا مدد کرنے کی فوجی تیاریاں شروع کردی ہیں۔ تمام دنیا میں محنت کش طبقہ کے دشمنوں کی جنگی تیاریوں سے اس جنگ کی نوعیت کو بالکل الم نشرح کردیا ہے اور اس حقیقت پر شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ جس جنگ میں سوویت یونین شامل ہے وہ اب شہنشاہی اور سرمایہ دارانہ جنگ نہیں رہی۔ دنیا

بھر کے ترقی پسند عناصر اور مزدور وکسان کی تمام جماعتوں نے متفقہ طور پر اس جنگ کو اینٹی کومنٹرن یعنی دنیا بھر کی ترقی پسند اور جمہوری سپرٹ کو مٹانے اور مزدور اور کسان کی بڑھتی ہوئی بیداری کو کچلنے کے لئے جنگ آج سے تقریباً دس ماہ قبل شروع کی جاچکی ہے' قرار دے کر ایسی کوششیں شروع کردی ہیں جسے کہ دنیا بھر کی دوسری مزدور جماعتیں فاشسٹ طاقتوں کو ختم کرنے کے لئے کررہی ہیں۔ گذشتہ چند مہینوں سے برطانیہ اور امریکہ کے عوام برابر اپنی حکومتوں سے مطالبہ کررہے ہیں کہ یورپ میں ایک اور محاذ قائم کیا جائے۔ اگرچہ اتحادیوں نے مغربی یورپ میں اپنے ہوائی حملوں کو زیادہ تیز کردیا ہے۔ لیکن امریکہ اور برطانیہ کے عوام بھی ان سرگرمیوں کو ناکافی قرار دیتے ہوئے فاشسٹ طاقتوں کو شکست دینے کے لئے یورپ میں ایک نیا محاذ جنگ کے کھولنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ''بلوچستان مزدور پارٹی'' کا یہ جلسہ حکومت برطانیہ سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ اس سے قبل کہ فاشسٹ طاقتیں سوویت یونین پر کوئی بڑا حملہ کرکے جنگ کے حالات کو وقتی طور پر نازک بنائیں یورپ میں ایک اور محاذ جنگ فاشسٹوں اور نازیوں کے خلاف کھولا جائے۔

"ب:

بلوچستان مزدور پارٹی کا یہ جلسہ جاپان کے حملہ کو عالمگیر فاشسٹ جنگ کا ایک حصہ سمجھتے ہوئے اس کو اس معنی میں بھی خطرناک قرار دیتا ہے کہ اس سے خود ہمارا ہندوستان خطرے میں پڑ گیا ہے۔ جاپان کے ان چیرہ دستانہ عزائم کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اس نے کوریا چین اور دوسرے ایشیائی ممالک کی آزادی چھیننے اور ان کو اپنی لوٹ کھسوٹ کا میدان بنانے کے لئے دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں، ہندوستان میں نیشنل گورنمنٹ کو اشد ضروری سمجھتا ہے تاکہ ہم جاپانی فاشسٹ طاقت کے مقابلہ میں اور اپنے ملک کی حفاظت کرنے کے لئے اپنے تمام ملک کے ذرائع استعمال کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہوں۔ جو اس جنگ کے جیتنے اور ہندوستان کے بچاؤ کے لئے نہایت ہی ضروری ہے۔ اس لئے ''بلوچستان مزدور پارٹی'' کا یہ جلسہ حکومت انگریزی سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ جلد سے جلد ہندوستان میں صحیح معنوں میں نیشنل گورنمنٹ قائم کرے۔

''بلوچستان مزدور پارٹی کا یہ جلسہ قطعی طور پر اس رائے کا ہے کہ آج جبکہ جاپان ہمارے

ملک ہندوستان کو غلام بنانے کا ناپاک ارادہ کئے ہوئے ہے، قطع نظر اس کے کہ حکومت انگریزی ہندوستان کو پوری آزادی دے کر اسے موثر طور پر جاپان سے مقابلہ کرنے کی بہتر پوزیشن نہیں دے رہا تو اس کے معنی ہرگز ہرگز یہ نہیں ہوسکتے کہ ہم اپنے ملک کے عوام کے مفاد کا خیال بھی نہ کریں اور جاپانی فاشسٹوں کو اس کا موقع دیں کہ وہ چین کی طرح ہمارے ملک کو پاؤں تلے روندیں۔ اس لئے ''بلوچستان مزدور پارٹی'' کا یہ جلسہ ملک کی تمام بہی خواہ جماعتوں خاص کر کانگریس اور مسلم لیگ سے اپیل کرتا ہے کہ آج کے نازک بین الاقوامی حالات میں اپنے اندرونی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر مقابلے کے لئے تیار ہوجائیں۔ تاکہ ہماری آپس کی نااتفاقی ملک کو جاپان کے مستبدانہ چنگل میں دینے کا باعث نہ ہو۔

''آخر میں ''بلوچستان مزدور پارٹی'' کا یہ جلسہ حکومت ہند کے ساتھ ساتھ حکومت بلوچستان سے بھی پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ جلد از جلد تمام مزدور اور کسان کارکنوں کو جو آج نظر بند، ملک بدر یا قید میں ہیں پر سے غیر مشروط طور پر پابندیاں ہٹائے۔ تاکہ وہ انسانیت اور اپنے مادر وطن کی درست خدمت انجام دے سکیں۔

دوسرا ریزولیوشن:

''بلوچستان مزدور پارٹی'' کا یہ جلسہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بولان کی توجہ مچ کی کوئلہ کانوں اور ان میں کام کرنے والے مزدوروں کی طرف کھینچتے ہوئے مطالبہ کرتا ہے کہ آج جبکہ جنگ کے باعث اشیائے ضرورت کا نرخ روز بروز گراں ہوتا جا رہا ہے اور جب کہ کوئلہ کا نرخ تین گنا بڑھ گیا ہے مزدوروں کو بھی پرانے نرخ سے تگنا نرخ دلایا جائے اور کوئلہ کانوں کی ان حالتوں کی خاص نگرانی کی جائے جو حادثات کا باعث بن کر مزدوروں کے اعضا کی شکستگی اور بعض اوقات موت کی صورت میں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔

تیسرا ریزولیوشن:

''موجودہ عالمگیر جنگ کے باعث غریب ہندوستان میں مزدور پر عرصہ حیات تنگ ہو چکا ہے۔ جس کا اصل سبب ضروریات انسانی یعنی اشیائے خوردنی کی حد درجہ گرانی ہے لہٰذا عمومی

طور پر اپیل کی جاتی ہے کہ مزدوروں کی اجرات میں لازماً اضافہ ہونا چاہئے تاکہ لوازماتِ حیات کو حاصل کرنے میں بہت حد تک تنگ نہ ہوں۔

''بلوچستان مزدور پارٹی'' ہندوستان کی دوسری سربرآوردہ جماعتوں کی پیروی میں آج کے جنگی حالات میں ضروری سمجھتی ہے کہ ایک والنٹیئر کور بنایا جائے جو شہریوں کی ہر نازک حالت میں ان کی خدمت اور امداد کرے اور ضرورت پر بروقت ہر سرکاری و غیر سرکاری حفاظتی اور امدادی دستوں کے ساتھ تعاون کرے۔ اس لئے ''بلوچستان مزدور پارٹی'' شہریوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔

جنرل سیکرٹری کی رپورٹ

چوں نگوں نم کہ جہاں کارگہ شیطان ست
دہ خدا حاکم و دھقان غلام ست اینجا

''یوسف''

یوم مئی

''محترم صدر اور میرے مزدور ساتھیو! اگرچہ مزدور تحریک بلوچستان میں مدت سے چل رہی تھی لیکن آج سے پورا ایک سال قبل ہم نے اسی جگہ یوم مئی کا بین الاقوامی تہوار نہایت شان و شوکت اور منظم طریقہ پر منایا۔ یوم مئی کا منانا کیا ہوا کہ یکے بعد دیگرے حکومت نے ہمارے مخلص ساتھیوں کو جبراً ہم سے جدا کرنا شروع کردیا۔ یکا یک دنیا کے حالات نے پلٹا کھایا اور نازی درندوں نے یورپ کی دوسری تمام قوموں کے خون سے اپنا منہ رنگنے کے بعد مزدوروں کی واحد سر زمین روس پر حملہ کردیا۔ جنگ کی نوعیت بدل گئی۔ اینٹی کومنٹرن پیکٹ کے تمام گروہوں نے بالشوزم کو مٹا دینے کا اعلان کیا۔ یہ جنگ اب مزدوروں کی جنگ ہوئی۔ دنیا بھر کے مزدوروں کے ساتھ ساتھ ہم نے بھی اینٹی فاشسٹ جلسہ منایا اور اس میں بلوچستان پارٹی کے سزا یافتہ اور بلوچستان بدر ممبروں پر سے پابندی اٹھائے جانے کا مطالبہ کیا لیکن اس کے باوجود حکومت نے اپنا رویہ ترک نہیں کیا۔ چنانچہ تمام کوئٹہ شہر میں ایسی دہشت پھیل گئی کہ شریف شہریوں کو ہمارے ساتھ

روزمرہ کے دوستانہ اور معاشرانہ تعلقات قائم رکھنا جرم دکھائی دینے لگا۔ہم نے ایسے مصائب میں اپنی ہمتیں نہیں ہاریں اور خاموش طریقہ کے ساتھ اپنے کام کو جاری کئے رکھا۔ چنانچہ آج آپ پھر ہمیں دیکھ رہے ہیں کہ ہم یوم مئی منظّم طور پر منا رہے ہیں۔

’’یہاں یہ ذکر کردینا نامناسب نہیں ہوگا کہ مزدور تحریک نہ کوئی نئی تحریک ہے اور نہ یہ ہم چند نوجوانوں کی پیدا کردہ ہے بلکہ یہ ایک تاریخی اور فطری حقیقت ہے کہ جہاں مزدور کسان ہیں وہاں ان کی بقائے حیات کا یہ لازمی عنصر یعنی مزدور تحریک بھی ضرور ہے۔ چنانچہ بلوچستان کی سیاسی تحریک کے اولین بانی نواب یوسف علی خان مگسی جن کا ہر سال یوم' تمام بلوچستان اور بلوچستان سے باہر کے بلوچ مناتے آرہے ہیں' خود مزدور لیڈر تھے۔ان کے وہ خطوط اور منظومات جو اخبارات میں چھپی ہیں اس حقیقت کے بین ثبوت ہیں۔ایک بار جب وہ بیمار پڑ گئے انہوں نے اپنے رفیق محمد امین کھوسہ ایم ایل اے سندھ کو خط لکھ کر ان سے پرزور اپیل کی کہ’’میرے مرنے کے بعد آپ بلوچستان میں مزدوروں کی یونین بنائیں ۔ ریلوے قلیوں' دکانوں اور ہوٹلوں کے نوکروں ، کوئلہ کانوں اور عمارتوں کے مزدوروں اور کھیتوں کو آباد کرنے والے کسانوں کی انجمنیں بنائیں............

یہ ہے میری امانت اور یہ ہے میری یادگار۔ بدقسمتی سے زلزلہ عظیم نے انہیں ہم سے چھینا اور مزدور تحریک کو مجبوراً بغیر سرپرست رہنا پڑا۔کوئٹہ میں دو ہزار مزدوروں کی ہڑتال' کان مہترزئی اور نصیر آباد میں کسانوں کا ایجی ٹیشن' مستونگ سٹیشن کے قلیوں اور مچھ کی کوئلہ کانوں کی متعدد ہڑتالیں اور نوشکی کے غریب باشندوں کا سرکاری ٹیکس کے خلاف تاریخی احتجاج' لیبر یونین اور اس کا عالمگیر انقلابی نشان ہتھوڑا اور درانتی ۔ یہ تمام واقعات بلوچستان میں مزدور تحریک کی ایک پرانی تاریخ کا مظہر ہیں۔ ’’بلوچستان مزدور پارٹی‘‘ اس مزدور تحریک کا منظّم نتیجہ ہے ۔ جو آج آپ کے سامنے موجود ہے۔‘‘

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ بلوچستان میں یوم مئی کی اولین تقریب بابو اور اس کے ساتھیوں سنگتوں نے ہی منعقد کی تھی۔ یہی رسم انہوں نے تواتر کے ساتھ اپنی ساری فعال زندگی میں

جاری رکھی۔ بورژوا سیاست دان آخر تک بلوچستان میں مزدور طبقے کی موجودگی اور لہٰذا اس کے سیاسی کردار کی اہمیت سے منکر رہے۔اس عمومی مزدور دشمن سیاسی فضا میں بابو’’تندیِ بادِ مخالف‘‘ کے نشانے پر رہے۔ان کے نزدیک یہ دن محض ایک جشن نہ تھا بلکہ یہ تو ظلم واستحصال کے خلاف انسانی جدوجہد اور قربانیوں کی علامت تھا۔تجدیدِ عہد وایقاں کا دن تھا۔ وہ اسے تقدس کے ساتھ ہر سال، اُس دن کی سپرٹ میں سرشار ہوکر مناتے۔حتیٰ کہ 1970ء میں بلوچستان پیپلز پارٹی کے زیر اہتمام یومِ مئی کی تقریبات تک میں شرکت کی اور جلسے میں ’’مئی روچ‘‘ کے عنوان سے اپنی بلوچی نظم ترنم سے پڑھی۔

مگر نظم پڑھنے سے قبل انہوں نے واضح کیا کہ’’کوئی اس غلطی میں نہ پڑے کہ میں پیپلز پارٹی میں شامل ہو چکا ہوں۔ میں تو محنت کشوں کی عظمت کا قائل ہوں اور ان کے مفادات سے مجھے گذشتہ 30 سالوں سے لگاؤ رہا ہے‘‘۔۔۔۔ حبیب جالب اور بابو میں یہ قدر حیرت انگیز طور پر مشترک ہے۔

حوالہ جات

1۔ جمالدینی، عبداللہ جان۔شاہ محمد مری کی کتاب’’موہن جوڑو کا جوگی‘‘ میں دیباچہ

2۔نوکیں دور کوئٹہ۔ یکم جنوری 1970ء صفحہ نمبر 5

3۔ایضاً

اخلاقی جرأت

عبدالکریم بابو اپنے نظریات سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ ان کے نظریات' بظاہر غیر سیاسی ہنگامی صورت میں بھی' ان کے راہبر تھے۔ مثال کے بطور؛

یہ 1948ء کا ماہِ رمضان ہے۔ پیراڈائز سینما کا نیا الاٹی سردار اسلم ہے۔ اس کے اور قریبی مسجد کے پیش امام ملاّ خیر محمد کے مابین ماہانہ وظیفہ پر اَن بن ہوگئی۔ چنانچہ ملاّ ایک رات تراویح کے بعد نمازیوں کو سینما ہاؤس پر حملہ کیلئے لے گیا کہ وہاں بقول اُس کے ''رمضان میں گانے بج رہے تھے۔'' سینما مالک سیانا تھا۔ اس نے نمازیوں کے غصے کو یہ کہہ کر چکلے کی طرف منتقل کر دیا کہ ''یہاں تو گانا ہے، وہاں جاؤ جہاں ناچ بھی ہے، جسم فروشی بھی۔'' لہٰذا منہ سے جھاگ ابالتا ہوا یہ مجمع ''بے حیائی اور فحاشی کو روکنے'' رنڈیوں پر ٹوٹ پڑا۔ طبلے یہاں، موسیقار وہاں اور ہارمونیم کہیں ۔طوائفوں کی چیخ و پکار۔ بابو اس وقت اپنے دوست اور انجمن تاجران کے صدر میر عالم کے ساتھ کسی قریبی ہوٹل میں چائے پی رہے تھے۔ شور وغل اور آہ وفغاں سن کر جب قریب آئے تو سارے قصے کا معلوم ہوا۔ بس، پھر کیا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، گھس گئے ہجوم میں۔ سازندوں اور طوائفوں کو چھُڑایا۔ اور خطابت کے جوہر دکھانے ہجوم سے مخاطب ہوئے کہ:'' یہ ایک غیر انسانی کام ہے، سماج نے جنہیں 'ننگِ انسانیت' اور 'اسفل السافلین' پیشے پہ مجبور کیا تو تم ان سے مزید کیا چاہتے ہو؟۔ میں یہ

حرکت قطعاً کرنے نہیں دوں گا''۔ اور واقعی یہ حرکت عبدالکریم نامی شخص نے نہ کرنے دی۔ سیسہ پلائی دیوار بن کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ اور اکیلا اتنے بڑے' چارج شدہ مجمعے کو واپس کر دیا۔ آج اکیسویں صدی میں بھی کوئی اُن سا ہو تو سامنے آئے۔

مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ دوسرے دن بلوہ کرنے کے الزام میں' اور لوگوں کے ساتھ' عبدالکریم کو بھی پکڑ لیا گیا۔ سرکار اور اس کے اہل کاروں نے سارے سازندوں اور طوائفوں کو اس کے خلاف گواہی دینے کو کہا مگر انہوں نے بابو کو دیکھتے ہی مجسٹریٹ سے کہا کہ یہ تو ہمارا محسن ہے، اس نے ہماری جانیں بچائی ہیں۔ اس قدر گرے ہوئے پیشے سے وابستہ لوگ بھی جھوٹ نہ بولیں، یہ عبرت ہے۔ بابو نے اُن کی توقیر جو کی تھی' انہیں اپنے جیسا انسان جو سمجھا تھا۔ اس لئے وہ انسان رنڈی تو ہو سکتے تھے، دروغ گو ہرگز نہ بن سکتے تھے۔ اس پوری آبادی میں بابو نے تین اشخاص گنوا دیے جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اور وہ تینوں اشخاص حسبِ توقع سی آئی ڈی ملازمین راجہ بشیر احمد، محمد یوسف کاسی اور قربان علی ہزارہ تھے (کون بڑا انسان ہے، طوائف یا۔۔۔؟)۔ ان کا جھوٹ بھی حسبِ توقع تھا کہ:'' یہ شخص ہجوم کی راہنمائی کرتے ہوئے پاکستان کے خلاف اور ہندوستان کے حق میں نعرے لگا رہا تھا۔'' (یہ دو بد بخت جملے پتہ نہیں کتنے اچھے انسانوں کے گھر اجاڑنے کا سبب بنتے رہے!!)

عبدالکریم کو بہت عرصے تک اس کیس میں پیشیاں بھگتنا پڑیں۔ مگر ہر پیشی بھگتنے پر اُسے اپنے ایقان سے' اپنے نظریے سے' اور اپنی کمٹمنٹ سے مزید محبت پیدا ہوتی جاتی۔ ایک بھی سازندے نے، ایک بھی طوائف نے اس کے خلاف گواہی نہ دی۔ پارٹی کے دوستوں کی طرف سے اس پہ بہت تنقیدیں ہوئیں اور اس کی اس حرکت پر اس کی گوشمالی کرنے کے مطالبے بھی ہوئے۔ حتیٰ کہ ہمارے محترم ترین راہنما جناب غوث بخش بزنجو نے یہاں تک کہا کہ:'' پارٹی کے دستورالعمل کی کونسی شق میں یہ لکھا تھا جس کی بجا آوری میں تم نے ایسا کیا؟'' (1) مگر بابو تو جانتا تھا کہ پارٹی کی ہر ہر شق کی تہہ میں یہی کچھ لکھا تھا۔

پھر اِن عورتوں کی آزادی اور آبادی کے لئے ایک منصوبہ تھا بابو کے پاس۔ ایک بار فضل

احمد غازی نے شورش بابو سے دریافت کیا کہ ان عورتوں کی آبادکاری کا کیا طریقہ ہے؟ شورش نے جواب دیا کہ ہمارے ہاں اکثر ملاّ صاحبان غیر شادی شدہ ہیں۔ حکومت اور ہم مل کر یہ بندوبست کر سکتے ہیں کہ یہ عورتیں اُن غیر شادی شدہ ملاؤں سے شادی کریں۔(2)

حوالہ جات

1۔نوکیں دور، کوئٹہ۔16 جنوری 1970 صفحہ نمبر 5

2۔اچکزئی، جعفر خان۔مقالہ، جوشورش صاحب کی یاد میں جلسے میں پڑھا گیا۔

''بھوک ہڑتال نہیں، لباس ہڑتال''

شورش بابوایک فعال اور انقلابی انسان تھے۔ وہ سب کے دوست تھے۔ بابو دوستوں سے محبت اور مخالفین سے شفقت رکھتے تھے۔ ایک بار سنٹرل جیل مچھ میں شورش بابو اور ان کے دیگر سیاسی قیدی دوستوں کا انگریز سپرنٹنڈنٹ مسٹر سی۔ ڈی ینگ کے ساتھ کپڑوں کے سائز کے بارے میں اختلاف ہوا۔ بات نہیں بن رہی تھی۔ صوبہ سرحد کے ایک سیاسی قیدی ارباب عبدالغفور خان خلیل مرحوم نے تجویز پیش کی کہ بھوک ہڑتال کریں گے۔ اس تجویز پر شورش بابو ناراض ہوکر کہنے لگے؛

''ارباب صاحب! اختلاف کپڑوں کے سائز پر ہے اور آپ ہمیں بھوک کی سزا دینا چاہتے ہیں۔''

ارباب صاحب نے سوالاً کہا کہ شورش صاحب پھر کیا کریں؟ اس پر شورش صاحب نے جواباً کہا کہ؛'' آؤ' بھوک ہڑتال' نہیں' کپڑا اہڑتال' کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔صبح جب سپرنٹنڈنٹ جیل کے دورے پر آئے تو آپ سب لوگ کپڑے اتار کر اپنے اپنے کمروں میں ننگے بیٹھ جائیں اور صاحب کو کہیں کہ جب تک ہمارے سائز کے کپڑے بنوا کر نہیں دو گے، ہم اس سخت سردی میں ننگے پھرتے رہیں گے۔''

دوسرے دن ایسا ہی کیا گیا۔ اور تب مجبور ہوکر اسی وقت سپرنٹنڈنٹ نے سائز کے مطابق کپڑے بنانے کا حکم جاری کر دیا۔ (بحوالہ، اچکزئی جعفر خان مقالہ، جوشورش صاحب کی یاد میں جلسے میں پڑھا گیا۔)

امن کانفرنس

1948ء میں بابو پاکستان بننے کے بعد سب سے اولین شخص کے بطور سوشلسٹ تحریک کی پاداش میں جیل گئے اور ان لوگوں میں سے پہلے سیاسی قیدی ہونے کا شرف حاصل کیا جو کہ آل پاکستان سوشلسٹ تحریک کی دارو گیر میں بلوچستان سے گرفتار ہوئے۔

بابو نے سارے لوگوں بالخصوص اپنے بچوں شاہدہ نسرین، شہک شفیق، رحیمہ ماہ جبیں کے نام اپنی وصیت میں لکھا؛''میری دلی تمنا اور خواہش ہے کہ آپ انسان دوستی کیلئے امن' سلامتی اور خوشحالی کے نیک کاموں میں ہمیشہ جدوجہد کریں۔ برائی' جنگ و جدل اور قتل مقاتلے سے اپنے آپ کو بچاتے رہیں۔ کیونکہ انسانیت کے عظیم مقاصد کو خودغرضی، برائی، جنگ وقتال زیب نہیں دیتے۔ محض اپنے مفادات کیلئے خودغرضی' برائی اور جنگ و جدل حیوان اور وحشیوں کا کام ہوتا ہے۔''(1)

1950ء کے اوائل میں شورش صاحب نے ایک پریس کانفرنس بلائی۔ اور کہا کہ؛''آج پھر سامراجی طاقتیں جمہوریہ چین کی آزادی کو سبوتاژ کرنے کے لئے کوریا کو اپنے نوآبادیاتی اور جنگی عزائم کے لئے اڈا بنانا چاہتی ہیں اور چیانگ کائی شیک کی فارموسا کی حکومت کو جمہوریہ چین کے مقابلے میں پھر سے برسراقتدار لانا چاہتی ہیں۔ سامراج ایشیا میں سب سے بڑی استحصالی منڈی

یعنی چین کی آزادی کو کیسے گوارا کر سکتا ہے۔ لہٰذا، سازش یہ ہے کہ تیسری جنگ کی تباہ کاریوں کو اس پر لاد دیا جائے اور انسانی معاشرے کی ہزاروں سال کی تہذیب کی تعمیر و ترقی کو تہس نہس کیا جائے۔ سامراجیوں کے ان عزائم کو امن ہی سے ختم کیا جا سکتا ہے اور پاکستان کی حکومت کو چاہیے کہ وہ پاکستان کو سامراجی عزائم کے میدانِ جنگ سے دور رکھے اور کوریا میں کسی بھی جنگی امداد سے پرہیز کرے۔ بلکہ کشمیر کے چالیس لاکھ عوام کے حق خودارادیت کے لئے زیادہ سے زیادہ جدوجہد کو بروئے کار لائے۔''

کامل القادری اپریل 1969ء میں اپنے ایک مضمون ''طرحِ نو'' میں لکھتے ہیں؛

''میں نے جب پہلی مرتبہ 14 اگست 1949ء میں سرزمین بلوچستان میں قدم رکھا تھا تو ایک پُراسرار سناٹا تھا۔ موت کی سی خاموشی دشت و جبال پر چھائی ہوئی تھی۔ شاہزادہ عبدالکریم خان ڈیڑھ سو ساتھیوں سمیت بغاوت کے جُرم کی پاداش میں دس برس کے لئے سنٹرل جیل مچھ میں قید و بند کی سزا بھگت رہے تھے۔ غرض کہ ایک قیامت گزر چکی تھی۔ ایک طوفان اُتر چکا تھا۔ آہستہ آہستہ سحر سکوت ٹوٹا۔ ابتداء' بلوچستان امن کمیٹی' کی تشکیل سے ہوئی۔ دیوانہ بکار خویش ہشیار کے مصداق میر عبدالکریم شورش نے موت سی خاموش فضا میں ہلچل پیدا کر دی۔ ایک نیا طوفان اُمڈ آیا۔''

حوالہ جات

1۔ ہفت روزہ ''نوائے وطن''۔ 11 اکتوبر 1969۔ صفحہ 4

دستخطی مہم اور گرفتاری

ابھی امن کانفرنس کے نتیجے میں دستخطی مہم جاری تھی کہ 17 اگست 1950ء کو شورش صاحب، محمد ہاشم خان غلزئی، مولوی حکیم' عبداللہ جان بازئی، مرزا فیض اللہ، عبدالصمد خان درانی اور محمد یوسف خان غلزئی کو ایف سی آر کے تحت گرفتار کیا گیا۔ گرفتاری کی وجوہ کو راز میں رکھا گیا تھا۔ ایک رات سٹی کوتوال کے لاک اپ میں رکھا گیا، تین دن ڈسٹرکٹ جیل کوئٹہ میں اور بعد میں جرگہ کے فیصلے پر مچھ جیل لے جایا گیا۔ اُس دن روانگی سے چند گھنٹے پہلے انہیں سی کلاس کے کپڑے پہنائے گئے اور جولان بھی لگائے گئے۔ شورش صاحب اور عبدالصمد کو اکٹھے ہتھکڑی لگائی گئی۔

خان عبدالصمد خان اچکزئی نے 13-2-51 کو بلوچستان کے مسائل اور اصلاحات کے حوالے سے ایک طویل خط جناب ڈاکٹر محمود حسین کو لکھا تھا جو اس وقت قبائلی کمیٹی کے وزیر تھے۔ اچکزئی صاحب لکھتے ہیں: ''میں یہ جواب اردو اخبارات میں شائع شدہ سوالات کو سامنے رکھ کر لکھ رہا ہوں۔ اس دُعا اور التماس کے ساتھ کہ خدا کرے یہ آپ تک پہنچے اور آپ کی کمیٹی اس نیک جذبہ کے تحت اس پر غور کرے۔ اصلاحاتِ بلوچستان کا ضروری مسئلہ کافی اہمیت کے ساتھ زیرِ غور آیا ہے۔ اور آپ اور آپ کی کمیٹی نے بھی اسے سمجھنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ جس وقت آپ تحقیق کے لئے بلوچستان تشریف لے گئے۔

بلوچستان بالکل بے چراغ تھا۔ وہاں کے اصلی باشندوں میں سیاسی رہنما تو کیا سیاسی شعور رکھنے والے تعلیم یافتہ اور محبِّ وطن حضرات یا تو جیلوں میں بند تھے یا بھاری ضمانتوں میں جکڑے ہوئے تھے یا حالات سے مجبور ہو کر وطن کو خیر باد کہہ چکے تھے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ صمد درانی، شورش وغیرہ قید کر دیے گئے ہیں اور کچھ قلات میں بھی پکڑے گئے ہیں۔ ان چیزوں سے آپ سے سیاسی شعور رکھنے والے لوگ سیاسی باتیں کرنا تو کجا ذاتی تعلق سے بھی ڈرتے نظر آتے ہیں۔''

اور 1951ء میں شورش صاحب کو مچھ جیل سے واپس کوئٹہ جیل منتقل کیا گیا۔

جیل سے رہائی کے بعد شورش بابو، میر غلام محمد شاہوانی اور میر گل خان نصیر کے ساتھ اخبار ''نوائے وطن'' نکالنے میں مصروف ہو گئے۔

صحافی بابو

1953ء میں میر غلام محمد شاہوانی نے ''نوائے وطن'' کے نام سے ایک ہفت روزہ کا اجرا کیا تو بابو نے اس میں لکھنا شروع کیا۔ وہ اپنے ولولہ انگیز مضامین سے ایک عرصہ تک اہلِ بلوچستان کے دلوں کو گرماتے رہے۔ اکتوبر 1957ء میں عبدالرحمٰن کرد کی زیرِادارت جاری ہونے والے ہفت روزہ ''نوائے بلوچستان'' اور اُس کے بعد عبدالرحمٰن غور کے ہفت روز ''میثاق الحق'' میں کام کیا اور اپنی زندۂ جاوید تحریروں کے ذریعے عوام کو ایک جدید اندازِ فکر عطا کیا۔

بابو نے باقاعدہ صحافت کی ابتدا برکت علی آزاد کے ہفت روزہ ''زمانہ'' سے کی تھی۔ اس کا بلوچی صفحہ بابو عبدالکریم خود مرتب کرتے تھے۔ اس میں وہ قبائلی وعلاقائی امور پر مضامین لکھتے تھے۔ ان کی سخت محنت کی وجہ سے یہ رسالہ اندرونِ بلوچستان لوگوں کا محبوب ترین رسالہ بنا۔

اسی طرح ایک روز بابو عبداللہ جان جمالدینی کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ مجھے ''نوکیں دور'' کے نام سے اخبار نکالنے کی اجازت مل رہی ہے۔ مگر حکومت کی پالیسی ہے کہ میرے پاس بینک میں کم از کم پانچ ہزار روپے ہونے چاہئیں۔ عبداللہ جان تو آج ہی' اور اچانک ہی اچھے نہ بنے۔ عادتیں تو دہائیوں میں بنتے بنتے پکّی ہوجاتی ہیں جو خوبی عادت نہ بنی ہو اور محض وقتی طور پر اپنالی جائے وہ غرض والی حرکت ہوتی ہے۔ میر عبداللہ جان تو عادتاً اچھے انسان ہیں۔

چنانچہ اچھائیوں کے عادی عبداللہ جان نے اپنے عزیز دوست ملک عثمان کاسی کو یہ بات بتائی تو انہوں نے خوشی خوشی بابو کے اکاؤنٹ میں پانچ ہزار روپے جمع کرائے۔ اُس زمانے میں پانچ ہزار پانچ لاکھ کے برابر ہوا کرتے تھے۔ اُس دل کی وسعت اور اُس کمٹ منٹ کی گہرائی کا اندازہ کیجئے جو آنکھیں بند کر کے یہ پیسہ تجوری سے نکالے اور ایک ایسے شخص کو ایسا اخبار نکالنے کے لئے دے دے جس کے جیل جانے اور نتیجتاً اخبار بند ہونے کے امکانات سو فیصد تھے۔ بلوچستان تم نے اپنی تاریخ کی گود میں کیا کیا خزانے چھپا رکھے ہیں!!

ملک عثمان کاسی کا فراخ دل، کشادہ سینہ اور حب الوطنی نہ ہوتی تو بلوچستان کے عوام کو ''نوکیں دور'' جیسا رسالہ قطعاً نصیب نہ ہوتا۔ بڑے آدمیوں کی ایک ہی حرکت ان کی عاقبت سنوارنے کیلئے کافی ہوتی ہے اور ملک عثمان نے تو اچھائیوں، خوبیوں کے صحرا طے کئے۔ ہماری نسل نے ان کا بہت سا قرضہ چکانا ہے۔

اسی طرح فصیح اقبال صاحب نے بھی نوکیں دور کا ڈکلریشن حاصل کرنے میں بابو کی خوب مدد کی۔ بابو چونکہ حکومت مخالف سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے تھے جس کی وجہ سے ڈکلریشن ملنے میں کافی مشکلات حائل تھیں۔ فصیح صاحب نے حکومت کے سامنے اسے اپنا پرچہ ظاہر کیا اور ڈکلریشن لینے میں کامیاب ہوگئے۔

8 جون 1962ء کو ایوب خان نے مارشل لاء ختم کردیا اور ملک میں نئے دستور کا نفاذ کیا تو اسی روز کوئٹہ سے بلوچی زبان میں دنیا کا واحد اخبار ہفت روزہ ''نوکیں دور'' جاری ہوا۔ اخبار کی افتتاحی تقریب پریس کلب کوئٹہ میں 8 جون 1962ء کی شام کو منعقد ہوئی۔ اور اس کا دفتر میزان مارکیٹ فلیٹ نمبر 2 میں قائم کیا گیا۔ جب بابو کے جنم جنم کے ساتھیوں کو اقتدار نصیب ہوا تو ان کی عدم توجہی کی وجہ سے بابو نے نوکیں دور احتجاجاً بند کردیا تو ساتھ ہی اس کا دفتر بھی خالی کر کے میونسپل کمیٹی کے حوالے کیا تو سب حیران ہوگئے کہ اتنی قیمتی جگہ بابو نے بغیر کچھ لینے دینے کے خالی کردی۔ حالانکہ کوئٹہ شہر کے دل میں واقع اس جگہ کی قیمت کروڑوں تک تھی۔

بابو کا یہ ہفت روزہ بلوچی زبان میں تھا اور یہ شاید بلوچی کا اولین ہفت روزہ تھا۔ اس کو

آ گے جانا تھا، بابو کے بلند افکار سے ذہنوں کو روشن کرنا تھا۔اس ہفت روزہ کے مقدر میں ایک مشن کا اجرا کرنا لکھا تھا............انسان دوستی،امن اور خوشحالی کا مشن۔

یہ بلوچی ہفت روزہ 8 دسمبر 1963ء سے اردو اضافے کے ساتھ شائع ہونا شروع ہوا۔مگر صرف دو ہی برس میں بابو یہ لکھنے پر مجبور ہوئے؛

''یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے کتنے مخلصانہ جذبہ ویقین کے تحت وطن عزیز پاکستان اور پاکستانی قوم کے ہمہ جہت مفاد میں وطن عزیز کی ایک اہم علاقائی زبان وادب بلوچی کو فروغ وترقی دینے کے پیشِ نظر تمام دنیا' پورے وطنِ عزیز پاکستان اور بلوچی زبان وادب کی پوری تاریخ میں پہلا اور واحد اخبار''نوکیں دور'' کو 8 جون 1962ء سے جاری کیا ہے،اور مجھے اس پر فخر ہے۔اور بلوچی زبان وادب کی تاریخ کے صفحات اس پر گواہ رہیں گے کہ میں نے آج تک عوامی سطح پر ایک مخلصانہ جذبہ کے تحت اور ایک صحت مندانہ معیاری وضع پر بلوچی زبان کے اس واحد اخبار کو زندہ رکھنے اور فروغ دینے کے لئے اپنی خدمات اور قربانیوں کو بروئے کار لایا ہے اور اپنی ہر طرح کی بے سروسامانی کے باوجود بھی اسے زندہ رکھا۔مگر بدنصیبی سے ابتدا ہی سے ہر محل اور ہر موقع پر بہت سے ابنائے وطن اور عزیزانِ قوم نے طرح طرح سے میری توہین کی ہے۔اور مالی حیثیت سے مجھے دکھ پہنچا کر میری حوصلہ شکنی کی ہے۔بلوچی زبان وادب کی ترقی اور فروغ میرا ایک ذاتی اور گھر کا کاروبار نہیں ہے۔جس سے یہ سمجھ لیا جائے کہ مجھے اس سے ذاتی فائدہ ہوگا۔

''یہ بلوچی زبان وادب کی ترویج وترقی کی تاریخ میں ایک دردناک المیہ ہے۔اور اب میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ابنائے وطن اور عزیزانِ قوم کو اب تک بلوچی زبان اور ادب کی ترویج و ترقی سے کوئی چاہ اور دلچسپی نہیں ہے۔لہٰذا آج کے بعد نوکیں دور کو پورے کا پورا اُردو میں شائع کروں گا۔البتہ اس کے ہر شمارہ میں بلوچی کا ایک ایک مضمون یا ایک نظم شائع کیا کروں گا۔جب ابنائے وطن اور عزیزانِ قوم کو عوامی سطح و وضع پر بلوچی زبان وادب کے فروغ وترقی دینے کا جذبہ واحساس دامن گیر ہوا،اور وہ بلوچی زبان وادب کے فروغ وترقی دینے میں ممدومعاون بن گئے تو انشااللہ اس مخلصانہ جذبہ ویقین کے ساتھ نوکیں دور کی خبریں اور مضامین صحافتی معیار و وضع پر شائع

ہوکر آپ کی خدمت میں پیش ہوا کریں گے۔لہٰذا میں اس پر ازحد نادم ہوں کہ بلوچی زبان وادب کے فروغ وترقی دینے کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات اور مصیبتوں کا مقابلہ نہ کرتے ہوئے شکست کا اعتراف کررہا ہوں۔خدا ہر زبان وادب دوست انسان کو اس سے بچائے (آمین)

ملک وقوم کا خیر اندیش

''بلوچی زبان وادب کی تاریخ اور وطن عزیز پر پاکستان میں عوامی وضع پر پہلا اور واحد بلوچی اخبار نوکیں دور کا مالک ومدیر۔عبدالکریم شورش

27 اکتوبر 1964ء''

1968ء میں نوکیں دور کا دفتر لی مارکیٹ کراچی میں بھی کھولا گیا مگر لوگوں کی بے توجہی کے باعث اسے بند کر دیا گیا۔

واضح رہے کہ نوکیں دور عام قسم کا اخبار نہ تھا۔ بلکہ یہ بلوچ عوامی قومی تحریک کا غیر اعلانیہ ترجمان تھا۔یہ تحریک ابدی تھی اور اس تحریک کی قوتِ محرکہ عالمگیر صداقتیں تھیں۔''نوکیں دور'' انہی عالمگیر صداقتوں کا بلوچستان میں علم بردار تھا۔اس کا دامن زبردست اہمیت کے حامل مضامین سے ہمیشہ سجا ہوا ہوتا۔ جہاں مصنف اپنی قوم کی بدحالی سے جھنجھوڑا ہوا لگتا تھا۔

نوکیں دور کبھی بھی ناوابستہ نہ رہا۔ایک گہری وابستگی رکھنے والے انسان کے وابستہ خیالات نوکیں دور ہی سے وابستہ ہوتے۔لہٰذا اخبار کی پالیسی میں کبھی ابہام نہ رہا۔اس میں دھند کبھی نہ چھپتا تھا۔ ہر معاملے میں واضح اور دوٹوک رائے ہوتی تھی۔(1) ایسا کبھی نہ ہوتا تھا کہ ہوا کے رخ کو دیکھ کر غیر متنازعہ مسائل پر تو لکھ دیا جاتا اور حساس موضوعات کو ترک کر دیا جاتا۔بابو اپنے اخبار میں ایٹم بم سے لے کر خلا کی تسخیر تک،جنگِ ویت نام سے لے کر نوآبادیاتی نظام تک اور بنیاد پرستی سے لے کر لبرل ازم تک ہر موضوع پر لکھتے تھے۔اپنے موقف،اپنے نظریہ کے عین مطابق لکھتے تھے۔ان کا فریم پہلے سے تیار ہوتا تھا اور وہ اپنی ہی عینک سے چیزوں کو دیکھتے تھے۔انہیں اپنے خیالات پر معقول اور واجبی تنقید بھی گوارا نہ ہوتی تھی۔ بارود کی طرح بھڑک اٹھتے تھے۔

شورش بابو اخبار نویسوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو اخبار کو صنعت نہیں بلکہ خدمت

اورقربانی کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔وہ فارغ اوقات میں چند ناخواندہ افراد کو اپنے ساتھ بٹھا کران کو اپنے اخبار کے مضامین سنایا کرتے تھے۔ایک مرتبہ ان کے ماموں ملک عبدالرحیم خواجہ خیل مرحوم نے کہا کہ شورش! یہ تم کیا کررہے ہو؟ کہنے لگے کہ ابلاغ کا یہ بھی ایک مؤثر انداز ہے۔ان غریبوں کا ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم ان کو اپنے اور دیگر ممالک کا حال اوراحوال سنائیں اوران کو بتائیں کہ ان کے حقوق کیا ہیں؟۔

بابو کی مالی حالت کبھی بھی موافق اور سازگار نہ رہی۔مگر وہ بہت متحرک شخص تھے۔ ہر اہم واقعہ کا اثر لیتے تھے اوراس پر اپنا ردِعمل ظاہر کرتے تھے۔مثلاً 25 جولائی 1969ء کو امریکہ کے خلا پر جانے کے وقت شورش نے بلوچستان اور بلوچی زبان میں خلانورد نیل آرم سٹرانگ اور خلائی جہاز کے تمام سائنس دانوں کو مبارکباد کا ایک تار بھیجا اور ساتھ ہی ''نوکیں دور'' کے پرچے بلوچی زبان اور اردو ترجمے کے ساتھ روانہ کئے اوراس طرح بلوچی زبان اور بلوچستان کو چاند پر متعارف کرنے کا سہرا پہن لیا۔بعد میں تینوں خلانوردوں نے شورش صاحب کے نام پیغام میں شکریہ ادا کیا۔

A MESSAGE FROM HOUSTON

National Aeronautics and Space Administration Manned Speceraft Center,

Houston,Texas 77058

Mr. Abdul Karim Shorish!

Editor Noken Daur Baluchi West Pakistan,Quetta,

We are grateful and proud to have participated in the achievement of our national goal of a successful lunar landing and return. We believe that as the exploration of our universe expands, so will the benefits of all mankind. We hope that the people of earth are now entering a new era of peace and common understanding.

To those of you who have offered encouragement and good

wishes, whose dedicated support has made our programs possible, and whose prayers have sustained us, we extend our humble thanks.

Thank you for the copy of the newspaper.

Sincerely

Sd/- Sd/-

Neil A . Armstrong Michael Collins

Commander Command Module Pilot

Sd/-

Edwin E. Aldrin,Jr.

Lunar Module Pilot

نوکیں دور کے مالک وایڈیٹر بابو عبدالکریم ہر سال باقاعدگی کے ساتھ اکتوبر عظیم سوشلسٹ انقلاب کی سالگرہ مناتے۔کبھی دیوان منعقد کرکے،کبھی مضمون لکھ کر اور کبھی سالگرہ مبارکباد کا ٹیلیگرام دے کر۔۔۔۔وہ سوویت سوشلسٹ انقلاب کو انسانیت کے عظیم مارچ کا ایک فیصلہ کن پڑاؤ گردانتے تھے۔انسان کی معاش سے لے کر اس کی مادری قومی زبان کی ترقی تک یہ انقلاب انسانی بہبود کا معراج ٹھہرا۔اور بابو اس انقلاب کے اثرات کی گہرائی اور بلندی کا زبردست ادراک رکھتے تھے۔

باشعور اور انقلابی بابو میں رفتہ رفتہ نئی خواہشیں جنم لیتی رہیں۔جن میں سے ایک خواہش ہزار گنجی کے مقام پر مینارِ امن کی تعمیر اور نوکیں دور کے دفتر کا قیام تھا۔جس کے لئے انہوں نے اہلِ بلوچستان سے امداد کی اپیل کی۔''نوکیں دور امدادی فنڈ'' قائم کیا۔لیکن کسی نے بھی اُن کا ساتھ نہیں دیا۔بلکہ ہمیشہ اُن کو،اُن کے نظریات،افکار اور کارناموں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔مذاق اُڑایا۔ان کی یہ خواہش کم فہم لوگوں کو عجیب اور انوکھی لگتی تھی۔

ایک دفعہ انہوں نے ڈرائی کلینز کی دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ تاریخی جملہ کہا

تھا کہ؛ ''اس شخص نے لوگوں کے کپڑے دھو کر دو منزلہ عمارت کھڑی کر لی۔ میں گذشتہ 40 برس سے لوگوں کے ذہن دھو رہا ہوں مگر تہی داماں ہوں۔''

بابو کا نوکیں دور ہمیشہ معتوب رہا۔ لہٰذا آمدنی اتنی ہوتی کہ بمشکل اخبار نکال پاتے۔ وہ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتے۔ نہ کسی سرمایہ دار سے نجی طور پر، نہ ہی کسی گروپ سے اور نہ ہی انہوں نے کبھی سردار سرکار سے اشتہار، مدد یا تعاون مانگا۔ وہ نہایت شان وشوکت سے کام کرتے اور شان وشوکت سے اخراجات کی تکمیل کی جستجو کرتے۔

نوکیں دور کو زندہ رکھنے کے لئے بابو عبدالکریم شورش نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ وہ ایڈیٹر کے فرائض سے لے کر چپڑاسی کے فرائض تک خود انجام دیتے تھے۔ انہیں اخباروں کا بنڈل سائیکل پر رکھے ہوئے اسٹیشن کی طرف جاتے ہوئے دیکھا جاتا اور کبھی اخبار کی تقسیم کا کام بھی خود ہی کرتے اور اخبار کی فولڈنگ بھی خود ہی کرتے۔ وہ بلاشبہ ہر وقت بلوچی زبان کی خدمت کر رہے ہوتے۔

تمام تر بے سروسامانیوں کے بیچ بقول غوث بخش صابر کے، اس دوران ایک اہم واقعہ بھی رونما ہوا جب ''نوکیں دور'' کے کاتب محمد عارف نے بابو سے پیسوں کا مطالبہ کیا اور کہا؛ ''شورش بابو اب پیسوں کے بغیر کام نہیں ہوسکتا۔'' بابو نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ نہ کہا۔ اگلے دن جب بابو دفتر آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک رومال تھا اور کہا؛ ''محمد عارف یہ کسی سُنار کے پاس لے جاؤ جو کچھ ملے اس سے کام چلاؤ۔'' اس رومال کے اندر کانوں کی تین چار بالیاں اور ایک انگوٹھی تھی۔ کچھ دیر تک تو عارف' بابو کو دیکھتے رہے اور کہا؛ ''بابو! اگر بہن کے زیور ہیں تو مجھ پر ان کی رقم حرام ہے۔ زیور تو میری بیوی کے گلے میں بھی ہیں۔'' بابو کو عارف جیسے لوگ ہی سمجھ سکے تھے۔

محمد عارف نوکیں دور کے مستقل کاتب تھے جو کہ پنجابی تھے اور یہاں کوئٹہ میں سیٹل تھے۔ یہ کمال بھی بابو کا ہی تھا کہ وہ ایک پنجابی کو بلوچی لکھواتے رہے اور عارف صاحب بھی پوری ایمانداری سے نوکیں دور کو زندہ رکھنے کیلئے بابو کا ساتھ دیتے رہے۔ ورنہ اپنے ہم زبانوں کی حوصلہ شکنیوں کا اندازہ تو بابو کی اس تحریر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ''جب ابتدا میں میں نے بلوچی زبان وادب اور ثقافت کی

ترویج وترقی اور نشوونما کے محور پر نوکیں دور جاری کیا تو مختلف ابنائے قوم اور اہلیانِ وطن کی جانب سے طرح طرح کے طعن وتشنیع کی بوچھاڑ شروع ہوئی۔ کسی نے کہا کہ شورش نے اپنے روزگار کے لئے بلوچی میں اخبار جاری کیا ہے۔ کسی نے کہا شورش بلوچ نہیں ہے۔ کسی نے کہا شورش کو بلوچی بولنا، پڑھنا اور لکھنا نہیں آتا ہے۔۔۔۔ غرضیکہ ادبی، لسانی، قومی، سیاسی اور مالی طور پر ہر ایک نے مخالفت شروع کر دی۔ ایسی صورت میں یہ مرحلہ سخت مایوس کن تھا۔ مگر خدا کے فضل سے میں نے مایوسی کو پاس آنے نہیں دیا اور......

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس شورش
سخن ہائے اہلِ زباں دیکھتے ہیں''

اُن کے اپنے بقول؛ ''بلوچستان کے قریہ بہ قریہ' در بہ در، شہر بہ شہر، دشت بہ دشت، کوہ بہ کوہ اور یم بہ یم کمر باندھی۔ ہر اہلِ زبان دوست سے گزارش کی کہ بلوچی زبان وادب اور ثقافت کی ترویج اور نشوونما میں نوکیں دور کی مدد اور تعاون کیجئے۔ کسی نے درخورِ اعتنا سمجھا اور کسی نے کچھ نہیں کیا۔''

یہی وطیرہ ان کا زندگی بھر رہا۔ اخبار کی ضخامت برسوں کے عمل میں گھٹتے گھٹتے محض ایک کارڈ کی سی رہ گئی مگر بابو کا انداز نہ بدلنا تھا اور یہ نہ بدلا۔

ابتدائی تین سالوں میں ''نوکیں دور'' 20x30 سائز پر شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد 20x30/4 سائز پر شائع ہوتا رہا اور اس کے تاریخی نمبر بھی شائع ہوتے رہے۔ نوکیں دور کا ٹائٹل بابو نے خود ڈیزائن کیا ہوا تھا۔ جو بابو کی روشن خیالی' ترقی پسندی اور بلوچ دوستی پر مشتمل نظریے کا بھرپور عکاس تھا۔ ٹائٹل پر دنیا کا نقشہ ہوتا تھا۔ ایک جانب سورج اور اس کی کرنوں میں یہ بلوچی مصرع کندہ ہوتا ''ہار بہات سبز بلوچی ءِ کشار'' اور دوسری جانب ''مشعل'' کا نشان جسے بعد میں بلوچ طلبا کی تنظیم بی ایس او نے اپنا نشان بنالیا۔

ابتدائی سالوں میں جب ''نوکیں دور'' پورے کا پورا بلوچی میں شائع ہوتا تھا تو بابو نے اس میں ایک صفحہ خواتین اور بچوں کیلئے بھی مخصوص کیا ہوا تھا۔ اور اس کے عنوان ہوتے تھے' خواتین

کے لئے؛ ''بانکانی نوکیں دور'' اور بچوں کے لئے؛ ''زہگانی نوکیں دور''۔ بلوچی کے اس ابتدائی زمانے میں بلوچی زبان میں بچوں کے لئے اچھی نظمیں تخلیق ہوئیں۔اسی طرح بلوچ خواتین کی بھی پذیرائی ہوئی اور بلوچ خواتین نے بلوچی میں لکھنا شروع کیا جن میں میر گل خان نصیر کی بیٹی، ہماری بہن، گوہر ملک سرِ فہرست تھیں۔

نوکیں دور کے معاونین میں آزاد جمالدینی، کامل القادری، ہاشم شاکر، صدیق آزات اور غوث بخش صابر قابلِ ذکر ہیں۔

ہفت روزہ ''نوکیں دور'' دنیا میں بلوچی زبان کا پہلا اخبار تھا۔اس اخبار کو مقبول بنانے کیلئے بابو عبدالکریم شورش نے دن رات محنت کی۔اخبار کی اشاعت بڑھانے کے لئے بابو نے ابتدائی تین سالوں میں تقریباً دس ہزار میل کا سفر کیا۔جس کا ذکر بابو نے اپنی درج ذیل فارسی نظم 'بلوچی نامہ' میں بھی کیا ہے؛

یہ نام جہاندار جہاں آفرین
بہ کشور پاک و بلوچی زمین
بہ نیکی بکو شیدائے دوستان
کہ نیکی بماند نِکو داستان
نہ دیدم زمِدت کسی درجہان
بیاراست نام و نشان بے زبان
زبان و ادب باعث فکر و فن
کزین بست زینت جاہ و جشن
اَلاابا بلوچاں دہید مژدہ ای
زنامہ ورے نوکیں دورنامہ ای
بسی رنج بردم دراین سالہا
زبان بلوچی بہ یفت گنجہا
زبہر بلوچی کشیدم سفر
بہ نزدیک ہرکس رسیدم بہ سر

نماندم دِہ ونماندم بزار
نماندم دشت و نماندم کہسار
بسی بردم نوکیں دور پیش ہرکس
ببانگ زدم نامش بہ پیش ہرکس
نہ از بہر خود چیزِمی خواستم
ہمہ بہر بلوچی می خواستم
نماندم غریب و نماندم امیر
نماندم صغیر و نماندم کبیر
نماندم ادیب و نماندم مدیر
نماندم دبیر و نماندم شہیر
نماندم سید نماندم قاضی
نماندم مُلا نماندم حاجی
نماندم و ڈیرہ نماندم تمندار
نماندم زردار نماندم زمیندار
نماندم سردار نماندم جام
نماندم ملک و نہ ماندم رام
نماندم شاہ و نماندم مہان
نماندم نواب و نماندم خان
نماندم صدر و نماندم گورنر
نماندم وزیر و نماندم کمشنر
نماندم افسر نماندم دپتی
نماندم منشی نماندم مفتی
نماندم ناظم نماندم تحصیلدار
نماندم ای سی نماندم رسالدار
نماندم وکیل و نماندم بیرستر
نماندم پروفیسر نماندم دکتر

نماندم مزدور نماندم دوکندار
نماندم دہقان نماندم زمیندار
نماندم حوالدار نماندم جمعدار
نماندم سپاہی نماندم صوبدار
نماندم بلوچ و نماندم افغانی
نماندم سندھی نماندم پنجابی
نماندم بنگالی نماندم ہندی
نماندم ایرانی نماندم روسی
نماندم ترکی نماندم رومی
نماندم جرمن نماندم فرانسی
نماندم سعودی نماندم دوبئ
نماندم یمن نماندم کویتی
نماندم چینی نماندم مصری
نماندم کابلی نماندم قندہاری
نماندم مسقطی نماندم عراقی
نماندم شامی نماندم افریقی
نماندم انگلسی نماندم کنیڈی
نماندم امریکی نماندم اٹلی
نماندم کو ریائی نماندم صومالی
نماندم سوڈانی نماندم فلپائنی
نماندم برما و ویتنامی
نماندم بلغاریہ و تاشقندی
گہی برسرِ ٹرک گہی پاپیادہ
گہی برسرِ جیپ گہی بردوچرخہ
گہی بر سر خر گہی برمہاری
گہی بر سر اسپ گہی برلاری

گہی برسر گاؤ گہی بر موٹر
گہی براُشتر گہی بر سکوٹر
گہی بر رکشہ گہی بیل گاڑی
گہی سر بس گہی گھوڑا گاڑی
گہی برسرِ راہ آہن بہ ریل
گہی بر پسینجر گہی برسر میل
گہی راہ دریا بالای کشتی
گہی برسرِ لانچ گہی بر دوخانی
گہی برجہاز و گہی بر خیال
ہمہ روز و شب دو دوران فعال
مشو شورشؔ نومید از دوستان
کہ نامت بماند نکو داستان

نوکیں دور کے پرچے عام طور پر مفت یا اعزازی تقسیم ہوتے تھے۔شورش بابو فرداً فرداً قدر دانوں سے اپروچ کرتے اور دس روپے سے 50 روپے تک کا چندہ وصول کرتے۔ وصولی عام طور پر کاغذ کی چھپائی اور کتابت کی مدات پر روز افزوں چڑھتے ہوئے قرضے کے شکم میں چلی جاتی۔ خدا بخشے ایک زمرد حسین تھے جو چھپائی کی اجرت برائے نام لیتے اور اکثر اوقات وہ بھی نہیں لیتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو یہ ہوتا کہ کاغذ بھی وہ پلے سے خرید کر شورش بابو کا نوکیں دور چھاپ دیتے۔۔۔۔مگر زمرد حسین تھے کتنے؟ زمرد حسین ہیں کتنے؟

بابو کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی بلوچوں کی صوبائی حیثیت کا تسلیم ہونا تھا۔یعنی بلوچستان کو صوبائی درجہ ملنا تھا۔یکم جنوری 1970ء کا دن تھا؛ یہ گویا بابو کیلئے عید کا دن تھا۔اس دن کے لئے بابو نے پہلے ہی سے نئے کپڑے سلوار رکھے تھے۔اپنی جدوجہد سے اٹوٹ کمٹمنٹ اور پکا اور سچا یقین دیکھئے۔چنانچہ اس دن نئے کپڑے پہن کر سیدھا ڈان ہوٹل گئے اور اس خوشی کے موقع پر ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو چائے پلائی اور بل اپنی جیب سے ادا کیا۔رات کو اس خوشی کے موقع پر کوئٹہ شہر میں مشعل بردار جلوس بھی نکالا گیا۔

انہیں شروع ہی سے بلوچستان اور بلوچوں کو ترقی کی پہلی سیڑھی پر دیکھنے کی خواہش تھی۔جس کے لئے انہوں نے ساری زندگی جدوجہد کی۔جب انتخابات ہوئے،اور بلوچستان میں بلوچوں کی نمائندہ حکومت بنی تو وہ بہت خوش ہوئے۔انہیں اپنے سیاسی ساتھیوں پر بڑا فخر تھا،گھمنڈ تھا،ناز تھا۔

پھر ہوا یوں کہ صوبائی خودمختاری ملی۔الیکشن میں جیتی ہوئی بابو کی پارٹی نے بلوچستان میں حکومت بنائی۔اور حیرت انگیز انداز میں ان کے ساتھیوں اور لیڈروں نے اقتدار کی کرسیوں پر بیٹھتے ہی انہی لوگوں کو نوازنا شروع کیا جو پہلے کے ہر دور میں نوازے جاتے رہے تھے۔۔۔اور شورش بابو کو اپنا نوکیں دور بند کرنا پڑا۔ان کے گھر میں فاقے ہونے لگے۔

صوبائی حیثیت ملنے والا اُن کا غرور زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا اور یہ خوشی ان کو راس نہ آئی جو اُن کے نوکیں دور کو کھا گئی۔وہ اپنے ہی سیاسی رفیقوں اور سیاسی شاگردوں کے دورِ اقتدار میں عدم توجہی کا شکار ہوئے۔انہوں نے کئی بار اپنے سیاسی رفیقوں سے نوکیں دور کو زندہ رکھنے کی التجا کی۔کیونکہ اُن کے پاس جو کچھ تھا وہ سب بلوچی زبان وادب کے فروغ کے لئے نوکیں دور کو زندہ رکھنے پر خرچ کر دیا تھا۔پیرانہ سالی میں بھی حد سے زیادہ کام کیا اور کثرتِ کام کی وجہ سے اُن کے ضعیف بازو شل ہوگئے تھے۔انہوں نے نہ تو کبھی سرمایہ کو اہمیت دی اور نہ ہی وہ اس کے قائل تھے۔یہی وجہ ہے کہ کبھی سرمایہ جمع کرنے کا خیال بھی نہ آیا اور نوکیں دور کو بھی کبھی فائدے کا کاروبار نہ سمجھا۔بابو نے زندگی بھر دغا بازی،مکاری،ایمان فروشی اور بلیک میلنگ سے نفرت کی اور ان علامات کو کسی صورت بھی اپنے اوپر غالب نہ ہونے دیا۔

تو پھر ان حالات میں نوکیں دور کو موت کے منہ سے کیونکر بچایا جا سکتا تھا۔بلوچوں کی امنگوں کا ترجمان،دنیا میں بلوچی زبان وادب کا اکلوتا ہفت روزہ اپنے ہی یار بیلیوں کے دورِ اقتدار میں بند ہوگیا۔ایک ایسا جریدہ ان لوگوں کی عدم توجہی کی وجہ سے بند ہو چکا تھا جس کے ٹائٹل صفحہ پر ہمیشہ خوبصورت حاشیوں میں خوبصورت رنگوں کے ساتھ ان کی تصویریں اور خبریں تفصیل کے ساتھ شائع ہوا کرتی تھیں۔جس کی خاطر بابو کو سخت ترین ایوبی مارشلا کی تھپیڑیں کھانا پڑیں۔بابو نے نوکیں

دور کے ذریعے نیپ کو اقتدار تک پہنچانے میں جو کردار ادا کیا تھا،اس کے لئے نوکیں دور کا پُرانا ریکارڈ گواہ ہے۔

بابو بلوچ اور بلوچی زبان وادب اور تہذیب وثقافت پر عاشق تھے۔1969ء میں انہوں نے بلوچی اکیڈمی سے اس بنا پر استعفیٰ دیا کہ اس کی کارروائی بلوچی زبان کے بجائے انگریزی میں چلائی جارہی تھی اور شورش صاحب کو جو دعوت نامہ بلوچی اکیڈمی کے طرف سے ملا تھا وہ بھی انگریزی میں تھا۔اکیڈمی نے حکومت سے گرانٹ لے کر ایک کتاب بلوچی کی بجائے انگلش میں چھاپی تھی۔شورش صاحب کا مندرجہ ذیل شعر اسی گھڑی کا ہے؛

بہ تچ شورش چہ اے آزمود گیناں
ترا ھچبر نہ رسی خیر چہ ایشان

حوالہ جات

1۔کوثر،انعام الحق۔بلوچستان میں اردو۔صفحہ 518

سامراج دشمن بابو

بابو اُن لوگوں میں سے قطعاً نہ تھے جو دنیا میں رونما ہونے والے واقعات سے لاتعلق رہتے اور کندھے اچکا کر'' مئے چے کاریں؟'' (ہمارا کیا کام) کہتے۔ بابو اِس کرہِ ارض سے متعلق ہر چھوٹی بڑی بات سے وابستہ و پیوستہ تھے۔ اُن کے لئے تو دنیا میں کہیں پر بھی ہونے والی بات'' بلوچ بات'' ہوتی تھی۔ جو کچھ بلوچ کے لئے اچھا ہوتا وہ دنیا بھر کے لئے بھی اچھا ہوتا اور جو کچھ بلوچ کے ہاں بے انصافی، ناروائی تصور ہوتی' وہ ساری دنیا کے لئے بے انصافی اور ناروائی ہوتی۔ ایسے تھے ہمارے بزرگ، ہمارے اکابر، ہمارے ہیرو اور ہمارے آئیڈیل!!

ایک کمیونسٹ ہوتے ہوئے بابو عبدالکریم امن عالمی سامراج کے بالعموم' اور اس کے سرکردہ امریکی سامراج کے بالخصوص' نشان زدہ دشمن تھے۔ وہ سامراج کی ہر بے انصافی پر اپنا ردِعمل ضرور دکھاتے۔

انہوں نے 7 مئی 1970ء کو ویت نام اور کمبوڈیا پر امریکی جارحیت کے خلاف امریکی صدر نکسن کو یہ ٹیلیگرام دیا؛'' ویت نام اور کمبوڈیا میں امریکہ کی جارحانہ پالیسی نے عالمی امن کیلئے زبردست خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ میں آپ سے مخلصانہ اپیل کرتا ہوں کہ اس جارحیت کو فوری طور پر بند کر دیں۔'' (18)

بابو کا رویہ چین کے انقلاب کے ساتھ بہت ہی رفیقانہ تھا۔ 1970ء میں چین کے پہلے مصنوعی سیارہ کی کامیابی پر انہوں نے چیئرمین ماؤ کو تار کے ذریعے تہنیتی پیغام بھیجا اور ان کے ذریعے چینی عوام کو مبارکباد پیش کی۔ ساتھ میں یہ بلوچی شعر بھی لکھ بھیجا؛

بالی استارا پہ چین ءِ دوستاں
لکھ مبارک بات پہ شمادوستاں (2)

بابو ہم بلوچوں کی شان تھے کہ انہوں نے ہمیں عالمی برادری کے ساتھ مضبوطی سے جوڑ رکھا تھا۔ وہ تو ہماری انقلابی قوم کے وزیر خارجہ تھے۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ لوگ ان کے بارے میں اور ان کے نظریے کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

پہلا خط لندن سے؛

'' برٹرنڈ رسل پیس فاؤنڈیشن

لندن

24 اپریل 1970ء

جناب عبدالکریم شورش ایڈیٹر نوکیں دور بلوچی کوئٹہ

پیارے جناب بلوچ!

آپ کے پانچ اپریل 1970ء کے خط کا شکریہ اور اسی کے ساتھ شامل آپ کے اخبار کے تراشوں کے لئے بھی ممنون ہوں۔ آپ نے جس فراخ دلی کے ساتھ لارڈ رسل کے متعلق لکھا ہے، اور اُن سے متعلق بلوچی مقالوں میں اظہار خیال کیا ہے، اور ان کے تراجم بھیج دیے ہیں۔ یہ بہت ہی قابلِ قدر ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارا تاثر ہے کہ لارڈ برٹرنڈ رسل ایسے انسان تھے جن کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ یہ فاؤنڈیشن امن کے مقاصد کے کام کو جاری رکھے ہوئے ہے جو انہوں نے جاری کیا تھا۔ موت سے کچھ ہی پہلے انہوں نے'' سپوکس مین'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا تھا جس کی تفصیل شامل ہذا ہے۔

بہترین خواہشات کے ساتھ

آپ کی مخلص

پامیلاوُڈ‘‘(3)

5اکتوبر1970ءکوانور السادات کو لکھے گئے خط میں انہوں نے جمال عبدالناصر کی موت پرتعزیت بھیجی۔وہ جمال عبدالناصر کی بہت تعریف کرتے ہیں۔(4)

’’کوئٹہ بلوچستان پاکستان

5اکتوبر1970ء

واجہ انور السادات

قائمقام صدر متحدہ عرب جمہوریہ قاہرہ

’’واجہ سفیر متحدہ عرب جمہوریہ اسلام آباد۔پاکستان

حدامزری جمال عبدالناصرِ ءِ ناگتّیں مرگ ءَ تہنا متحدہ عرب جمہوریہ اومشرق وسطیٰ ءِ عرب اُلس واستمانا بلکنا افریقہ وایشیاءِ مظلوم و بے وسّیں قوماں ہم پہ درد کرتگ۔اگن، ما بگوئشاں کہ سامراج ءِ مخالف تیوگیں دنیاءِ اُستمانا ناصرءِ مرک (وفات) ءَ سوگی کرتگ تو ردنہ بیت۔

’’جمال ناصر عربانی یک مزن تریں نامی سیاسی سروکے ات۔پرچے کہ ناصر سامراج ولٹ و پلوکانی ظلم وزوراکی ءَ چہ افریقہ وایشیاءَ دورکنگا ئت۔پاکستان و بلوچستان ءِ اُلس واُستمان ءِ مردم جمال ناصرءِ مرکا چہ سک سوگی بوتگنت پرچے کہ ناصر صیہونیت او سامراج ءَ چہ عرب ڈیہاں او مشرق وسطیٰ ءَ درکنگا مڑگ ءَ ئت۔خدامرزی ناصرءِ ناگتیں مرک ءِ وختا من وتی حالتاک (اخبار) ہفتگی نوکیں دورءِ یک خاصیں تاک (شمارہ) چھاپ کرتگن اوگوں اے کا گداہور شمے حدمتا دیم دیئگا اُن...........‘‘۔

’’آخر ءَ من پہ وتی دِل ءِ زہرگ ءَ گوئشین کہ منا خدامرزی جمال ناصر مرکا سک پدرد کرتگ۔ومنا امیت انت کہ شمانی اے پہ دردیں وغمی ایں پُرسی کلھوءَ خدامرزی ناصرءِ کہول اومتحدہ عرب جمہوریہ ءِ اُلس واستمانا گوں عرض کن اِت۔‘‘(5)

حوالہ جات

1۔کریم امن ہفت روزہ نوکیں دورکوئٹہ۔7 مئی 1970 صفحہ نمبر 3

2۔ایضاً صفحہ نمبر5

3۔ایضاً صفحہ نمبر5

4۔نوکیں دور12 اکتوبر1970

5۔شورش،عبدالکریم ہفت روزہ نوکیں دور۔2اکتوبر1970۔

شاعری

صلاحیتوں سے بھرپور بابوؔ شاعری بھی کرتے تھے۔۔۔۔سیاسی وسماجی شاعری۔بلوچی شیریں زبان کا شاعر عبدالکریم شورش۔اس نے پہلے نہ صرف اپنی قوم کیلئے آزادنوشت کی راہ میں شاندار راستہ بنایا بلکہ اپنی زبان اور ادب کے لئے بھی نہ بھولنے والی خدمات انجام دیں۔جس طرح کہ عبدالکریم کا تخلص شورش ہے، اسی طرح اُن کے اشعار میں بھی بہت شور اور ولولہ دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ سچ بات ہے کہ شاعر اپنے اِردگرد کے ماحول اور حالات سے متاثر ہوتا ہے۔دوسرے لفظوں میں شاعر اپنے وقت کے حالات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔اِسی لئے ایک قومی شاعر اپنے اشعار میں اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی حالات بیان کرتا ہے۔شورش کی شاعری بھی اپنے وطن کے حالات سے متاثر ہوئی ہے۔اُن کے اشعار میں عشقیہ حصہ تو بہت ضعیف ہے مگر قومی اشعار میں بلاشبہ اتنی زیادہ قوت ہے کہ وہ عام بلوچ کے جذبات کی درست ترجمانی کرسکتی تھی۔

اُن کے شعروں کے چند مصرے نمونے کے طور پر پیش ہیں۔پہلے تو دیکھئے ون یونٹ ٹوٹنے اور بلوچستان بن جانے کی مسرت کا اظہار وہ کیسے کرتے ہیں؛

پہ اے مستاگ وشیناں مبارک
بلوچستان اُلس ءَ را مبارک
بلوچستان مئے پاکیں دیارا
گل و گلزار مئے ڈیہہ وڈگارا
پہ شان و شرف بلوچی نام توارا
وطن پاکیں براساں گوں ھوارا
بیا ایت شورش ءِ سنگت و بیلاں
بزوریت بیرک شانِ بلوچستان

ترجمہ:

بلوچستان کے لوگوں کو یہ خوشخبری مبارک ہو
بلوچستان کے عوام کو مبارک ہو
بلوچستان ہمارا پاک وطن ہے
اور گُل وگلزار ہے ہماری یہ زمین
تو اے ہم وطن بھائیو! اپنی شان اور شرف، ننگ وعزت کی خاطر آؤ
پاک وطن کے دوسرے بھائیوں کے ساتھ مل کر
شورش کے ساتھیو دوستو
مل کر بلوچستان کی شان کا پرچم اُٹھاؤ

بابو کی ایسی شاعری ہمیں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔خیال میں بہت طاقتور، البتہ فنی لحاظ سے کافی کمزور۔جس کی انہیں کوئی خاص پرواہ بھی نہ تھی۔

شورش سے امن

عبدالکریم ذہنی اور جسمانی طور پر کمیونسٹ تحریک میں پیوست تھے۔ وہ انسان کے ہاتھوں انسان کے معاشی استحصال، تذلیل اور قتل وقتال کے سخت خلاف تھے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے قیام کیلئے جدوجہد کر رہے تھے جس میں کوئی ڈاکہ نہ ہو، ڈنڈا نہ ہو، چیخ وکراہ نہ ہو، جنگ، تباہی بربادی، لوٹ مار یا کوئی اور تخریبی مصیبت نہ ہو۔ اُن کی زندگانی کی ساری جدوجہد امن وسلامتی اور عوامی ترقی وخوشحالی کی خواہش کے محور پر گھوم رہی تھی۔ تب انہوں نے سوچا کہ ان کے نام کے ساتھ شورش کہاں سجتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے نہایت جرات کے ساتھ اپنے نام کے آخر میں لفظ ''شورش'' کو کھرچ پھینکا اور عبدالکریم کے ساتھ ''امن'' کے لفظ کو ہم آغوش کر دیا۔ اور اس طرح ان کا نام ''کریم امن'' ٹھہرا۔(1) انہوں نے دسمبر 1969ء میں شورشؔ کو خیر باد کہتے ہوئے امنؔ نام اپنا لیا تھا۔

بیا ایت ھم دلیں سنگت و بیلاں
دلان زوریت منی وشین گالاں
کریم ءَ زرتگنت وش امن ءِ نام
پہ شان و شرف بلوچی ایں نام

یوں ہمارے بابو عبدالکریم' شورش سے کریم امن ہزار گنجی ہوگئے۔ انہوں نے عالمگیر انسان دوستی اور امن کا علم تھام لیا اور اسی کو اپنا مذہب مان کر اس کی خاطر جدوجہد کو اپنا مقدر بنا لیا اور وہ مرتے دم تک امن اور انسان دوستی کا پرچار کرتے رہے۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی تحریروں میں کثرت سے کیا ہے۔ ایک نمونہ دیکھیے؛

''آج جب اٹھاون سال اپنی زندگی کی تمام جدوجہد اور اپنے دل و دماغ اور ضمیر وخمیر کے ایک ایک کونے ایک ایک گوشے کا جائزہ اور محاسبہ کرتا ہوں تو مجھے انسانیت کے وسیع تر مفادات کے محور پر مبنی نوع انسان کے لئے امن وامان اور سلامتی وخوشحالی ملک قوم' بلوچی زبان وادب اور ثقافت کی فلاح و بہبود اور تعمیر وترقی کیلئے مخلصانہ جذبات کے ساتھ جدوجہد کے ماسوائے کوئی اور برائی اور تخریب پسند عنصر دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے ذہن فکر میں یہ خیالات اشعار کی صورت میں نہ ڈھلتے؛

پہ نیکی کنیت جہد اے دوستان
کہ نیکی شمئے نام ءَ کنت داستان
شمئے نام توار ءَ کنت برزشان
جہان ءَ براہ کنت گوں عِزوشان

''یہ حقیقت ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ اور میں نے اپنی زندگی کے دوران کرہ ارض کے کسی بھی خطے میں بنی نوع انسان اور نوع حیوان پر کوئی جنگ، تباہی بربادی لوٹ مار استحصال یا کوئی اور تخریبی مصیبت لائی ہوئی دیکھی ہے تو میرے دل وضمیر اور ذہن وفکر نے رنج و محن اور انتہائی افسوس کیا ہے اور اس سے نفرت کی ہے۔

''جب میں اپنی تمام زندگی کی سماجی، سیاسی اور صحافیانہ جدوجہد کا جائزہ لیتا ہوں تو اسے انسانیت کے عظیم تر مفادات کے محور پر امن اور اس کے خوش آئند نتائج سلامتی تعمیر وترقی اور خوشحالی کی راہ پر جادہ پیما پاتا ہوں۔ ایسی صورت میں جب میری زندگی کی تمام تر جدوجہد امن اور سلامتی کے محور پر گھوم رہی ہو، اپنے نام کے ساتھ لفظ ''شورش'' کو اس کے بعد زیبا نہیں سمجھتا۔ گو کہ 1939ء

سے اس کے ساتھ امن سلامتی ملک قوم بلوچستان' اردو بلوچی اور فارسی زبان وادب اور ثقافت کی تعمیر وترقی اور نشوونما کے لئے نہ نمٹنے والی جدوجہد اور خدمات وابستہ و پیوستہ ہیں۔ بظاہر اگر دیکھا جائے' شورش نام کو خیر باد کہنے کے معنی ہیں کہ تیس سالہ خدمات پر پردہ ڈالا جائے۔لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکے گا کہ اب یکم جنوری 1970ء سے وطن عزیز میں ایک ایسا دن طلوع ہو رہا ہے۔جس کی کرنیں ایک فلاحی معاشرہ اور مملکت کو منور منعکس کر رہی ہیں۔ایسی صورت میں امن و سلامتی تعمیر وترقی اور خوشحالی کیلئے اذہان وافکار کے لئے جدوجہد کی زیادہ ذمہ داریوں کی ضرورت ہوگی۔اس لئے میں نے اپنا نام' عبدالکریم امنؔ' کا انتخاب کر کے اپنا لیا ہے اور بشرطِ زندگی میری تمام تر جدوجہد امن' سلامتی تعمیر وترقی اور خوشحالی کے محور پر جادہ پیما ہوا کرے گی۔''(2)

مگر یہ بات ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ ''امنؔ'' ان کے نام کے ساتھ شامل محض ایک تخلص نہ تھا بلکہ یہ ان کے نام کا جزو لاینفک بنا۔

انہوں نے نہ صرف اپنا نام بدل ڈالا بلکہ ساتھ میں اپنے ایک بیٹے کا نام بھی ''امن دوست'' رکھا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس دن یعنی یکم جنوری 1970ء کو بلوچستان کی صوبائی حیثیت بحال ہو رہی تھی۔اس سے چند روز قبل بابو نے کریم امن نام اپنا لیا اور بعد میں ہزار گنجی سے ابدی تعلق کی بنا پر تادم مرگ ''کریم امنؔ ہزار گنجی بلوچستان'' لکھتے رہے۔

حوالہ جات

1۔نوکیس دور'24 دسمبر 1969 صفحہ نمبر 5

2۔امن ،عبدالکریم۔نوکیس دور کوئٹہ 24 دسمبر 1969۔صفحہ نمبر 5

جوتوں کی دکان

قندھاری بازار میں ان کی جوتوں کی ایک بڑی کشادہ دکان ہوتی تھی جس سے انہیں وافر آمدنی ہوتی تھی۔بابو اپنی تحریک سے اس قدر وابستہ تھے کہ اپنی دکان کا نام بھی انہوں نے پارٹی کے نام سے منسوب کرکے ''قلات سٹیٹ نیشنل شوز'' رکھا تھا۔جب تک ان کی یہ دکان موجود تھی وہ اپنے بے روزگار ساتھیوں اور حاجت مندوں کی دل کھول کر مدد کرتے تھے۔چونکہ دکان کا نام پارٹی کے نام پر رکھا گیا تھا اس لئے پارٹی کے مخالف عناصر اس دکان کی بھی مخالفت کرنے لگے۔جس کے نتیجے میں دکان میں عجیب وغریب قسم کی چوریاں اور نقب زنیاں ہوتی رہیں۔یعنی ہر جوڑے کا ایک جوتا چرا لیا جاتا اور دوسرا وہیں چھوڑ دیا جاتا۔

بالآخر ایک وقت ایسا آیا جب انہیں اپنی دکان کو خیر باد کہنا پڑا۔

نوکیس دور: جہازی سائز سے کارڈ تک

ہفتہ روزہ نوکیس دور کو بابو نے جون 1962ء سے بلوچستان کے ہمہ جہت مفادات (قومی جمہوری، سماجی، سیاسی، اقتصادی) اور بلوچی زبان و ادب کی ترویج و توسیع اور نشو و نما کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر جاری کیا تھا۔ اور انہوں نے انہی اعلیٰ مقاصد اور نصب العین کے محور پر ایک تعمیری اور ترقی پسندانہ انداز فکر و فہم سے اسے شائستہ طور و طریق پر پروان چڑھانے کی مقدور بھر جدوجہد کی۔

یاد رہے کہ اس زمانے میں ون یونٹ کا شکنجہ اس بری طرح سے کسا ہوا تھا کہ بلوچستان' بلوچ اور بلوچی زبان و ادب اور ثقافت کے لئے لکھنا اور کام کرنا بہت کٹھن کام تھا۔ انہی مندرجہ بالا مقاصد کی جدوجہد میں بسا اوقات بابو اور ان کے رفقائے کار کو مختلف النوع دشواریوں اور مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑتا تھا۔ مگر یہ ساری مشکلات ان کے مخلصانہ جذبۂ عمل کی راہ نہ روک سکیں۔ بلکہ ان سے جذبۂ شوق خدمت کو مزید تقویت ملی۔ اگرچہ حالات اور خصوصاً اُن کے مالی مسائل ابتدا ہی سے ناساز گار رہے پھر بھی دس سال تک جذبۂ خدمت و عمل میں لغزش نہیں آئی۔ لیکن ستم ظریفی روزگار نے انہیں جون 1972ء میں غیر متوقع طور پر ایک ایسے صدمے سے دوچار کر دیا کہ ان کے لئے نوکیس دور کی اشاعت کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔

لیکن اُس وقت بلوچستان کے حالات ایسے تھے کہ بلوچستان بابو کی آواز کی غیر حاضری کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ایسے وقت میں نوکیس دور کی اشاعت کو ملتوی کرنا مناسب نہ تھا۔ چونکہ نوکیس دور کی دوبارہ اشاعت کے لئے کچھ نئی رکاوٹیں شامل ہو چکی تھیں۔ اس لئے وہ اسے جلدی دوبارہ شائع نہ کر سکے۔ چنانچہ بابو نے نوکیس دور کی اشاعت کے بجائے ہزار گنجی بلوچستان کا ڈھائی ہزار سالہ کیلنڈر شائع کیا۔ وہ اس کیلنڈر کو بعد کی چار اشاعتوں میں شائع کرتے رہے۔

بعض صحافی دوست اور بلوچستان اور بلوچی زبان و ادب کے مفادات کے بہی خواہ یہ مخلصانہ مشورہ دیتے رہے کہ بلوچی زبان و ادب کی صحافت میں اس واحد اخبار کو بند نہیں ہونا چاہئے۔ چنانچہ بابو نے دسمبر 1972 میں نئے ڈیکلیریشن کے لئے درخواست دی۔ یہ ڈیکلیریشن جا کر 19 فروری 1973ء کو ملا۔ مگر' ہم سب یہ جانتے ہیں کہ؛

شیشۂ بشکستہ را پیوند کردن مشکل است

بہرحال' 14 مئی 1973ء کو نوکیس دور کی دوبارہ اشاعت کے انتظامات کو مکمل کر دیا گیا۔

جب کتابت اور دوسرے انتظامات مکمل کر کے 18 مئی 1973ء کو پرچہ بغرضِ طباعت متعلقہ اسلامیہ پریس کوئٹہ میں لے گئے تو پرنٹر نے یہ کہتے ہوئے چھاپنے سے انکار کر دیا کہ ڈائریکٹر اطلاعات بلوچستان نے انہیں نہ چھاپنے کی ہدایت کی ہے۔'' چنانچہ لکھی ہوئی کاپیاں اسی طرح بغیر چھپائی کے رہ گئیں۔ جو آج تک میرے پاس پڑی ہوئی ہیں۔'' (1)

انہیں پھر نئے ڈیکلریشن کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا پڑی۔ آخر کار 31 جولائی 1973ء کو نیا ڈیکلریشن حاصل کیا گیا۔

اُن کے اپنے بقول' یہ سال سوا سال کا عرصہ انہوں نے جس کرب و اذیت کے عالم میں گزارا' اسے بیان کرنے سے قلم قاصر ہے۔ اس دوران نہ کسی مسیحا نے ان کے زخموں پر پھاہا رکھنے کی کوشش کی اور نہ کسی غم گسار کو چارہ گری کی توفیق ہوئی۔ اس کے باوجود انہوں نے امید و رجا کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا اور اپنے نصب العین کی قندیل کو اپنے سینے میں روشن رکھا۔

پیسے کی فراہمی کیلئے حالات اور بھی نامساعد تھے۔ وہ بیماری، اور کئی حادثات سے دو

چار ہوئے' اخباری اخراجات تھے کہ بڑھتے ہی جاتے تھے، پارٹی لیڈروں کی چشم پوشی تھی اوراحباب کی لاتعلقی تھی۔ان سب عوامل نے مل کر بلوچستان کے اس ابوالانقلاب کو بیمار کردیا۔

نوکیں دور مالی بلاکیڈ کی وجہ سے گھٹتے گھٹتے کارڈ سائز کا بن گیا۔بابو یہ کارڈ خودلوگوں میں تقسیم کرتے اوراس طرح اخبار کا چندہ لے لیتے۔

گوکہ یہ آخری دور میں اُن کا ذریعہِ روزگار بھی تھا۔لیکن اصل مقصد اپنے موقف کا اظہار کرتے رہنے کا تھا۔ بابو یہ کام بہت خوبی اور خوبصورتی سے کرتے رہے۔معاشی و مالی تنگدستی نے انہیں اس غیر مروج اور نا آشنا کام پر لگا دیا۔آپ دیکھیں گے کہ بابو کے کارڈز نے کہیں خالص صحافت کا کام دیا اور کہیں پمفلٹ کا۔ وہ ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر اپنا موقف پیش کرتے رہتے تھے۔وہ اپنے نظریات ان کارڈوں میں گاہے بہ گاہے بیان کرتے رہتے۔

چونکہ اُس زمانے میں بابو کے کچھ اور ہم فکر اخبارات ورسائل بھی نکلتے تھے اس لئے بابو کے کارڈوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں اُن رسالوں اور جریدوں سے بھی گاہے بہ گاہے مدد لینی پڑے گی۔ان میں ملک محمد پناہ کا نوائے وطن کوئٹہ تھا۔سی آر اسلم کا ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' لاہور تھا۔ اور پھر افغانستان سے ہفت روزہ ''سوب'' بلوچی تھا۔

1975ء کا اولین کارڈ دراصل سالِ نو کی مبارک باد کا کارڈ ہے۔اس کارڈ کے نیچے بابو کے ہاتھوں قلم سے جنوری 1975ء کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔اور ساتھ 500 لکھا ہوا ہے جو کہ ظاہر ہے کہ کارڈوں کی کل تعدادِ اشاعت ہوگی۔کارڈ کا بقیہ حصہ تقریباً 1974ء والے کارڈ جیسا ہے۔بس ایک طرف جنوری، فروری اور مارچ کے کیلنڈر ہیں اور دوسری طرف اپریل، مئی اور جون کے۔البتہ کارڈ کی پیشانی پر وہ نئے سال کی مبارک بادیوں دیتے ہیں؛

پہ نوکیں سال کریم امنءِ دعا انت

بلوچستان دی تل آباداوسی

(اللہ آمین!)

مگر بلوچستان پہ دل وجان سے فدا ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ کسی تنگ نظری کا شکار ہوتے ہیں۔ان کی رحمتیں، دعائیں تو سب کے لئے ہیں۔اسی دعا کے نیچے انگریزی میں اپنی

بشر دوستی کا یوں اظہار کرتے ہیں:

May the new year 1975 bring

peace and prosperity for every one

اس قدر پاکیزہ افکار، ہمدرد جذبات اور ستھرے نظریات۔۔۔۔بابو عبدالکریم یقیناً ایک..........

'تمہیں ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا!'

مگر وہ تو شاید بادہ خوار بھی نہ تھے۔گھر میں دو وقت کی روٹی نہ ہو، دل میں دکھی انسانیت کا درد ہو تو کون بادہ خواری کا متحمل ہوسکتا ہے۔اور پھر ولایت ہوتی کیا ہے؟ ہم نے تو اِس کو بھی عقیدے سے جوڑ رکھا ہے۔ولایت ہرگز یہ نہیں ہے کہ آپ کسی جادوگر کی طرح چھڑی کسی کی داڑھی پر لے جائیں تو چھڑی کے سر پہ ایک سرخ پھول کھلنے لگے، نہ ہی کسی کے کان سے مرغی کا انڈہ نکالنے کو ولایت کہتے ہیں۔دل میں انسانیت کا درد جس قدر زیادہ ہوگا، اسی قدر بڑا ولی کہلائے گا وہ دل۔یہی ایک پیمانہ، یہی ایک گز ہے ولایت کے لئے ۔ ہر چرسی، موالی یا گلیوں میں ننگ دھڑنگ پاگل شخص ولی نہیں ہوا کرتا۔

کارڈوں میں آپ کو جگہ جگہ نظر آئے گا کہ بابو ماقبل فیوڈل نظام کی بنیاد پرستی کے خلاف کھل کر تو نہ بول سکے مگر انہوں نے اس نظام کے خلاف اپنی مزاحمت کو مست توکلی والی مزاحمت سے ہم رنگ ضرور کر دیا۔انسان کی مجموعی بھلائی کی تمنا کرنا فیوڈل فلسفے کا اُلٹ ہی تو ہے۔فیوڈل نیک بخت تو ساری بھلائی ساری نعمتیں اپنے پاس رکھتا ہے اور رعیت کو افلاس اور جہالت کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیتا ہے۔

فروری کے کارڈ پر بھی ہمارے اس ولی نے اُن کی تعداد قلم سے 500 لکھی ہے۔باقی سارا کارڈ جنوری کے کارڈ جیسا ہے، البتہ یہاں وہ نئے سال کی مبارکباد کچھ اور طرح سے دیتے ہیں:

پہ نوکیں سال کریم امنءِ دعا انت

تمام دنیا دی پہ امن و امان او سی

اگر کسی کو بلوچی اور پشتو سمجھ نہیں آتی تو وہ اس کے ترجمے کا مطالبہ نہ کرے کہ، بابو اپنے

اسی کارڈ میں اس کا انگریزی بھی ترجمہ خود ہی کرتے ہیں۔Spellingاور گرامر کی صحت کی ذمہ داری اُنہی پر ہے۔ میں جوں کا توں نقل کررہا ہوں کہ اُن کے شعر کی روانی زخمی نہ ہو جائے؛

May the year 1975 bring brotherhood

peace and prosperity to the world

سارے جہاں کی خیر مانگنے والے بلوچوں میں سے' آج کی نسل میں سے جب کوئی ''ہمارا دوسروں سے کیا واسطہ؟'' کہتا ہے تو یہ لاتعلقی کی انتہا لگتی ہے۔گُل خان جیل میں بیٹھ کر کیوبائی عوام کو سلام بھیجتا تھا، بابو اپنوں کی دھتکار کی غراہٹ میں بھی انسانیت کی خیر مانگتا تھا، آزاد بھوکا رہ کر عالمی سیاست کے جھمیلوں میں بلوچستان ڈھونڈتا رہتا تھا اور ملک پناہ شُشک کے خلاف جدوجہد کو عالمی سامراج دشمن جدوجہد کا لازمی حصہ قرار دیتا تھا۔مختصر یہ کہ ہمارے اکابرین کبھی بھی بلوچستان کو یکتا و تنہا کوئی عجوبہ بنانے کے چکر میں نہ پڑے بلکہ وہ ہمیشہ اسے عالمی تناظر میں رکھتے رہے۔اس لئے ہم حق بجانب ہیں کہ عالمی امن کے حق میں بولیں۔ہمیں بوسنیا، فلسطین، روانڈا، کراچی اور افغانستان پر بولنا ہے، یہ ہمارا موروثی فریضہ ہے۔ ہم بابو جیسے اپنے دیگر اکابرین کو خوبصورت پوشاک پہنا کر بالائی طبقات کے رنگین اور ایئر کنڈیشن عجائب خانوں میں رکھنے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ بلوچ انٹرنیشلسٹ بنے بغیر بلوچ رہتا ہی نہیں ۔اب تو عالمی گاؤں کی بات انسانیت کا معیار، اور گز بن چکی ہے ۔ہم جانتے ہیں کہ بابو انسان اور انسانیت الاپ کر پاگل قرار دیے گئے تھے۔اب انہی جرائم کے کفارے کا دور ہے۔ایک مقدس انسان کو پاگل بنا دینے والے آج' پیسہ پجارو اور پگ کی تاریک راہوں میں مردم خور درندے بن چکے ہیں۔ساری دنیا ان پاگلوں پر قہقہے لگا کر ہنس رہی ہے۔ہم سب اس بات کے گواہ ہیں۔

بابو اسی کارڈ کی دوسری جانب چوٹی پر شیخ سعدیؒ کی خوبصورت درگت یوں بناتے ہیں؛

کریما بہ بخشائے برحالِ ما

بہ امن و ترقی ایں سالِ ما

مگر' شیخ سعدی پر بابو کا حق شفع جائز ہے۔ وہ سارا سارا دن سعدی کو گنگناتے رہتے تھے۔لہٰذا مذکورہ کارڈ پر بابو نے سعدی کے شعر کا جو پوسٹ مارٹم کیا ہے، وہ اس میں حق بجانب تھے۔

مختلف راہوں سے جب ایک ہی منزل کی جانب جانے والے راہی ایک جگہ مل جاتے ہیں تو اگلا سفر تو مشترک ہے۔منزل و مستقبل مشترکہ ہوتے ہیں۔سعدی سعدی نہیں رہتے، بابو بابو نہیں رہتے۔ مگر سعدی کے اشعار کو توڑنے مروڑنے کے لئے بھی تو اتنی ہی پاک روح چاہیے۔فرد اجتماع کی بھلائی اور بہتری کے لئے جب اپنی ذات کی نفی کر لیتا ہے، تب ہی وہ عبدالکریم رند بلوچ سے بابو امن بن جاتا ہے اور ساری انسانیت کی میراث کا محافظ اور وارث بن جاتا ہے۔اور سعدی نے انسانیت کے بلند آدرشوں کا جس قدر پرچار کیا ہے، مشرق میں کون اس کا ثانی ہونے کا دعویٰ کرسکتا ہے؟۔''گلستان اور بوستان'' والے نے بہت سی سرکش روحوں کی راہیں بدل ڈالیں۔زندگیوں کے معمولات کو تتر بتر کر دیتی ہے سعدی کی شاعری۔

بابو اپنے اس مذکورہ کارڈ میں نیچے نئے سال کی دعا ایک اور ادا سے کرتے ہیں؛

پہ نوکیں سال کریم امنءِ دعا ایں

بلوچستان دی پاکستان سرہ آباد اوسی

انگریزی ترجمہ ملاحظہ ہو؛

May the new year 1975 bring peace and

prosperity to Pakistan and Balochistan

یہ اس بڑے انسان کی اخلاقی جرأت ہی تھی جس نے اُس زمانے میں اُسے اپنے دل کی بات کہنے کی ہمت دلا دی جب پاکستان کے لئے دعا کرنے کا فیشن قطعاً نہ تھا۔ ماحول جنگی بن چکا تھا۔مارشل لائی پاکستان اور اس کے متشدد ریاستی اداروں کے لئے ہمدردی کے دو بول ہی کسی کو بلوچ قوم کا ''غدار'' بنانے کے لئے کافی تھے۔ جنگ نے بھٹو کو جاہل بنا دیا تھا۔بھٹو اور اس کی پارٹی، بھٹو اور ریڈیو اور ٹی وی ، بھٹو اور اخبارات، بھٹو اور فوج، بھٹو اور مجسٹریٹ (الغرض سارے ریاستی ادارے) بلوچ قوم کے نام لیواؤں کو غدار، وطن دشمن، سابقہ سوویت یونین کے ایجنٹ (خاد کا نام تو ترہ کی صاحب کے بعد ایجاد ہوا) اور گاندھی کے چیلے قرار دے کر اپنی بادشاہی برقرار رکھے ہوئے تھے۔ان فتوؤں سے اِن اداروں نے جناح سے لے کر بھٹو تک پاکستان کی ہر شخصیت، ہر ادارے اور ہر چیز کے بارے میں تحقیر آمیز ضرب الامثال کو کامیابی سے مروج کر دیا تھا۔

اپنے ان کارڈوں میں بابو ایک تشریح بھی کرتے ہیں۔ وہ یوں کہ اپنا اتہ پتہ اور حتمی ٹھکانہ اپنی محبوب ترین انگریزی رباعی لکھتے ہیں؛

From London to China and Korea

upon this highway lies my borea (tomb)

Find me in the greenwood of Chiltan

& Hazar Ganji heart of Balochistan

بابو عبدالکریم نے اپنی قبر کے قریب ''مینارِ امن'' بنانے کی وصیت کی تھی۔ مینار کا نقشہ بھی اپنے رسالے میں چھاپا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل کچھ دوستوں نے ''بابو میموریل کمیٹی'' کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور کوئٹہ میں اس کا بینک اکاؤنٹ کھولا۔ کسی نے ایک ٹکہ بھی نہ ڈالا۔ ہم نے رسالے میں بھی اس کمیٹی کے بارے میں اعلان چھاپا تھا۔ صرف تعلیم کے اُس وقت کے صوبائی وزیر ڈاکٹر مالک بلوچ چل کر ''نوکیں دور'' کے دفتر آئے اور پچاس ہزار کا چندہ دیا۔ ہمیں اندازہ ہوا کہ مینار بنانے کے لئے زمین کے ٹکڑے کی بھی ضرورت ہوگی۔ چنانچہ زمین کے مالک سے جب زمین مانگی تو اس نے ایک نہیں، دو نہیں، پانچ ایکڑ دینے کا اعلان کیا۔ ہماری ساری منت سماجت کے بعد کہیں جا کر وہ یہ عطیہ ایک ایکڑ تک کم کرنے پہ راضی ہوئے۔ کوئٹہ جہاں آج کل کوئی ایک فٹ زمین کسی نیک کام کے لئے دینے پر تیار نہیں ہوتا وہاں ایک شخص پورا ایک ایکڑ ایک ٹکہ لئے بغیر ''بابو کمپلیکس'' کی تعمیر کے لئے نچھاور کردے تو ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ''دنیا انہی درویشوں کی بدولت قائم ہے۔'' کمٹمنٹ کا ٹھیکہ کسی ایک شخص نے تو نہیں لے رکھا ہوتا؟۔ بابو کا یہ وارث بھٹو اور ضیا الحق کے جان لیوا ٹارچر سیلوں میں سے پک کر کندن ہوگیا ہے۔ جناب سکندر کرد نے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی سختی سے تاکید کردی۔ مگر ہم تو لکھنے والے لوگ ہیں۔ اور ہمارے نزدیک ایسی نیکی والی بات کو چھپانا ایک بھیانک جرم ہوتا ہے۔ جب بلوچستان کے درمیانہ اوپری طبقے کا ایک بڑا حصہ حرام کی روزی بٹورنے کے بین الاقوامی مقابلے میں لگا ہوا ہو وہاں ایسے پیغمبرانہ وصف رکھنے والے بلوچ کا ڈھنڈورا نہ پیٹنا ایک سماجی گناہ ہے۔ ''بابو کمپلیکس'' کا افتتاح سکندر کرد اور ڈاکٹر مالک بلوچ کے ہاتھوں کرانا چاہئے کہ وہی اس کے اصل حقدار ہیں۔

مگر بابو کے مقبرے(Tomb) کی تعمیر کے لئے کچھ افراد نہیں بلکہ پورے عوام کو اپنا حصہ ڈالنا چاہئے۔ وہ سیاسی ورکروں، مزدوروں اور دانشوروں کے مشترکہ ہیرو تھے۔ اچھائی کے پیکروں کی یادگاریں چوک چوک پر کھڑی ہونی چاہئیں تاکہ برائی کے شیطان ان یادگاروں کے تقدس کے نور سے ڈر کر آبادیوں میں آہی نہ سکیں۔ بابو کی یادگار ہمیں شیطانوں، شیطانی ہوس اور شیطان کے چیلوں سے بچائے گی۔ یہ امن اور سچائی کی چوکیدار ہوگی۔

ایک اور خاص بات فروری 1975ء کے کارڈ میں یہ ہے کہ انہوں نے اس پر لکھا ہوا ہے کہ ہدیہ پانچ روپے۔ (5 روپے کے ہدیے سے بابو کے بے شمار بنگلے ملک کے چاروں صوبائی دارالحکومتوں میں موجود ہیں۔ شمالی علاقہ جات کے تفریحی مقامات میں بھی ان کی کوٹھیاں ہیں۔ ان کی اولاد پجیرو و جیپوں میں موج اُڑاتی پھرتی ہے!!)۔ یہ معاشرہ اخبار اور رسالوں کو مفت بھی نہ پڑھنے والوں کا معاشرہ ہے بھائی!۔ بابو بلوچ، کارڈ اور پانچ روپے!!!۔ ع

ماما، ماتہ خندہ رازی

نوکیں دور کے ایک حاشیہ لگے ہوئے پیڈ کے صفحے پر ہمیں ایک ٹیلیگرام کی ٹائپ شدہ کاپی ملی ہے جو بابو نے 8 اپریل 1975ء کو جناب ذوالفقار علی بھٹو کو بھیجی تھی۔ یہ ٹیلیگرام رومن رسم الخط میں بلوچی زبان میں لکھی گئی ہے۔ یہ شاید اولین ٹیلیگرام ہے جو کسی نے بلوچی زبان میں ملک کے وزیراعظم کو بھیجی ہو۔ متن یوں ہے؛

Waja Zulfiqar Ali Bhutto.

Wazirazam Pakistan Quetta

Man pursitkan dilla shumara washat kanan

(.) Dua lotin ki shumae atkanag Balochistane tivagen masalehani hal kanaga pa kamyab bibit (.) Pakistan wa Balochistan budnakien kar chido ziast demarawan bibant.(.)

Karim Amn

Hazar Ganji Balochistan.

اسی زمانے میں نوکیں دور کی طرح نوائے وطن کی تسلسل کے ساتھ اشاعت میں بھی کئی کئی ماہ کے ناغے ہونے لگے۔اس کی ضخامت بھی روز بروز گھٹتی جارہی تھی۔ پیسہ، قاری اور سرکار، صحافت کے لئے کتنی جان لیوا تکونی گردش ہوتی ہے۔ملک محمد پناہ کو بھی منزل مقصود تک ساتھ دینے کا وعدہ کرنے والے تمام ہمسفر دوستوں نے تنہا چھوڑ دیا تھا۔مگر اس ملنگ اور درویش کو دیکھو کہ اسے نہ ندامت ہوئی ، نہ مایوسی اور نہ شکست کا احساس۔ وہ انجام سے باخبر تھے مگر پھر بھی اپنے معین کردہ راستے کو چھوڑنے پر ہرگز تیار نہ تھے۔اوران کے راستے کی منزل تھی ’’عوامی جمہوریت ،سوشلزم اور استحصال سے پاک غیر طبقاتی معاشرہ کا قیام۔‘‘ ملک صاحب اپنی راہ پر ثابت قدمی سے چلتے ہوئے امر ہو گئے ۔نہ صرف مالی مشکلات اُن پر آن پڑیں بلکہ ان کے ہم خیال دوست بھی دوکشتیوں میں سفر کرنے کی موقع پرستی کا شکار ہو کر ملک صاحب کے لئے تکلیف کا باعث بن رہے تھے۔ملک صاحب کے اپنے بقول’’ آج کے بہت سے نام نہاد سوشلسٹ جو پڑھے لکھے سنجیدہ لوگوں کے حلقوں میں بڑے عظیم مارکس وادی مشہور ہوئے پھرتے ہیں، سادہ لوح لوگوں کے سامنے ظالم طبقے میں ایک خود ساختہ امتیاز گھڑ کر اپنے پسندیدہ ممدوحوں کے طبقاتی چہروں کو چھپانے کی تگ و دو میں سرگرم ہیں۔‘‘ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔گو کہ سوویت یونین کی تباہی نے آٹھ دس سال کے لئے کمیونزم کے امکانات پر بحث مباحثہ کو عمومی طور پر کم کر دیا ہے اور بہت ساری اصطلاحات اپنے معانی کھو کر خود بخود معدوم ہو چکی ہیں مگر فیوڈل بنیاد پرستی کے لئے نرم گوشہ رکھنے والے سوشلسٹ دانشور آج بھی کوئی نہ کوئی دلیل گھڑ کر اپنی موقع پرستانہ اور منافقانہ کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ ملک صاحب کا شروع کردہ جہاد آج بھی اسی طرح برمحل ہے۔ملک صاحب کے نصف صدی پرانے فقرے آج بھی حسب حال ہیں اورانہیں دہرانا ہی آج کا موقف ہے؛

’’۔۔۔ملک کے اقتدار پر فائز جاگیردار بھی دل سے پرانے قبائلی ڈھانچے کو عام جاگیردارانہ ڈھانچے میں بدلنے کے حق میں نہیں ہیں، کیونکہ صدیوں سے پرانے اور ناموافق سماجی ڈھانچے کی گھٹن سے آزاد ہونے والے بلوچ عوام کی بیداری ملک میں رائج جاگیردارانہ نظام کے قیام کو بھی برداشت نہیں کر سکے گی۔گویا بلوچستان سے قبائلی سماج کی شکست اور ریخت کے ساتھ ہی

پورے ملک کے جاگیردارانہ ڈھانچے کو متزلزل ہونا ناگزیر ہو جائیگا۔‘‘(2)

بلاشبہ ملک محمد پناہ سوچ کے اعتبار سے بلوچستان میں سب سے زیادہ واضح دانشور تھے۔ انہوں نے معاملات کو صحیح پس منظر میں دیکھا اور اپنے قائم کردہ موقف میں کبھی دھند، کبھی اگر مگر نہ آنے دی۔

’’ہم، عوام کے دوستوں، دشمنوں کو صرف دو طبقوں میں بانٹنے کے حق میں ہیں اور وہ ہیں ظالم و مظلوم۔‘‘(3)

اس دور میں ملک محمد پناہ کو سخت مالی مشکلات کا شکار ہونا پڑا۔ وہ خود بلوچستان کے ہفت روزہ اخبارات کی ایسوسی ایشن کے صدر بھی تھے۔مگر دوسرے کئی رسالوں کی طرح ان پر بھی عنایتوں ،بخششوں کے دروازے تو بند تھے ہی، انہیں ان کا جائز مقام بھی نہ دیا گیا۔جبکہ ’’منظور نظر اخبارات کے مالکوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے لکھ پتی بنا دیا گیا ہے۔‘‘

مگر ہمارے قافلے کے سربراہ تو چٹان کی مانند تھے۔انہیں یہ مشکلات اپنے موقف سے کہاں ہٹا سکتی تھیں کہ’’ ایک مثبت نصب العین کی خاطر یہ دشواریاں تو لازمی ہوتی ہیں ۔موجودہ نظامِ حیات و نظامِ سیاست کو بدلے بنا ان دشواریوں کو گلوں شکووں کے ذریعے دور نہیں کیا جاسکتا۔‘‘

بابو عبدالکریم کے جولائی 1975ء کے کارڈ میں سابقہ کارڈوں سے امتیازی بات دونوں طرف نصیحت والے اشعار کی ہے۔اس کارڈ پر جولائی سے دسمبر کا کیلنڈر چھپا ہے۔ایک طرف چوٹی پر سرخ سیاہی سے لکھا ہے؛

اگہ راستی ، شما امن و جوانی لوٹیت
کہ دروغ و بدی زان بہ لیری اوساتئی

اس پدرانہ نصیحت کا انگریزی ترجمہ یوں کرتے ہیں؛

If you like real peace and prosperity
so you keep away from lies and cruelty

کارڈ کی دوسری جانب ہمارے لئے یہ پیغام ہے؛

پــــہ نیــکــی کــنیــت جهد اے دوستـــاں
چــہ نیـکــی بــہ کــی ستــاسـو نـوم جــاوداں

O, Dearst! struggle for human goodness

so you may earn good name in dearness

اس دوران ملک محمد پناہ فیوڈل نظام کے خلاف بہت بہادری سے اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے تھے۔ کاش ملک صاحب کو موت نہ آتی۔ یا وہ اپنا کوئی پیروکار چھوڑ جاتے جو اُن کے جہاد کو اسی طرح دوام اور تسلسل سے جاری رکھ سکتا۔ اچھے لوگ مر گئے، گند انظام ابھی تک جیتا ہے۔ ملک صاحب کی باتیں آج اتنی ہی صحیح ہیں، جتنا کہ کل تھیں۔ بلوچستان کی سیاہ بختی کا بنیادی سبب وہ گلا سڑا فیوڈل نظام ہے جو کسی قسم کی ترقی اور بیداری کو برداشت نہیں کر سکتا۔ جاگیردار طبقہ خواہ حزبِ اختلاف سے ہو یا حزبِ اقتدار سے؛ یہاں پر نہ کسی سیاسی بیداری کا خواہاں ہے نہ تعلیمی ترقی اور نہ ہی اقتصادی و معاشی بہتری کا۔ کیونکہ سیاسی بیداری، تعلیم کا فروغ اور معاشی خوشحالی وہ عناصر ہیں جن کی موجودگی میں اس فرسودہ سماجی ڈھانچے کا ٹوٹنا اور ایک اجتماعی معاشرے کا وجود میں آنا، یقینی ہو جاتا ہے۔ جس پر اس کے استحصالی مفادات کی اجارہ داری صدیوں سے قائم ہے۔ یہ جو فیوڈل طبقہ بظاہر دو متحارب گروہوں میں بٹا ہوا نظر آتا ہے تو اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں کہ ان میں کوئی ایک گروہ سیاسی طور پر کسی مثبت نظریے اور ترقی پسندانہ طرز فکر کا پیروکار ہے، اور دوسرا کسی منفی نظریے اور رجعت پسندانہ انداز فکر کا حامل ہے۔ دراصل ان کا باہمی تضاد صرف اقتدار کے لئے ہے۔ ملک صاحب بغیر کسی لگی لپٹی کے، بغیر کسی حیل و حجت اور تردد و تامل کے کہتے ہیں؛'' جو حضرات فریقین کے اس اندرونی تضاد کے ڈانڈے اپنی خود ساختہ منطق کے حوالے سے کھینچ تان کر ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے امتیاز سے جا ملاتے ہیں اور ایک ہی طبقے کے دو گروہوں کو مختلف خانوں میں بانٹنے کی تاویلیں پیش کرتے ہیں؛ دانستہ طور پر نیم پختہ ذہنوں کو صحیح طبقاتی سوچ سے ہٹا کر گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ ترقی پسندانہ نقطہ نظر سے انسانی معاشرہ میں صرف دو خانوں کی گنجائش ہے اور وہ ہیں ظالم اور مظلوم کے خانے۔ اس کے علاوہ طبقاتی سماج میں کسی تیسرے خانے کی دریافت صریحاً لغو اور غلط ہے۔ استحصالی طبقے اور ان کے پالتو گماشتے ہر ملک میں ابھرنے والی طبقاتی

جدوجہد کے دھارے کو فیصلہ کن رخ اختیار کرنے سے روکنے کے لئے ہمیشہ اس قسم کی مکارانہ تاویلیں پیش کیا کرتے ہیں جن کے نتیجے میں طبقاتی جدوجہد میں رکاوٹ اور انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح عوام کے خلاف بھڑکا کر استحصالی طبقے کے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جسے عوام دشمنی کے علاوہ کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا۔۔۔۔''

آج ساری صورت حال جوں کی توں ہے۔ کچھ بھی نہ بدلا۔ صرف ایک تبدیلی آئی۔ وہ یہ کہ اس وقت اس صورتحال کو بیان کرنے والا، سمجھا دینے والا، اس پر تنقید کرنے والا، احتجاج کرنے والا، ایک ملک پناہ موجود تھا۔ آج وہ نہیں ہے۔ نظریہ اس قدر بانجھ بھی ہو سکتا ہے؟ نظریہ کی آبیاری تو مدلل، ان تھک اور مستقل مزاج لکھاری کرتے ہیں۔

ملک صاحب محض ایک آدھ مغالطوں کی صفائی نہیں کرتے۔ ان کے ''نوائے وطن'' میں تو ہمیں ہر نظریاتی مسئلہ پر ملک صاحب ڈٹ کر اپنا موقف سناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل جو الیکشن ہوئے تھے تو اس میں پاکستان کے بہت سے لوگوں نے نواز شریف کو اس لئے ووٹ دیے تھے کہ وہ شاید قومی بورژوازی کا نمائندہ ہے۔ اس لئے ترقی ہوگی اور سماج سرمایہ داری میں داخل ہوگا اور قبائلی جاگیرداری نظام کمزور ہو جائے گا۔ ملک صاحب کے زمانے میں بھی اس طرح کے طفیلی موجود تھے جو اپنی سیاسی قلابازیوں کو لفاظی کے پردوں میں چھپاتے رہتے تھے۔ ملک صاحب ان پر اس طرح برستے ہیں؛

'' کچھ عرصے سے حکمران جماعت کے وفاقی اور صوبائی ارکان اسمبلی کی طرف سے بار بار یہ بات دہرا کر عوام کو باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ بلوچستان میں سرداری نظام دم توڑ رہا ہے اور اس کے سماجی و سیاسی اثرات نیست و نابود ہو رہے ہیں۔ جو لوگ اس نظام کے معاشرتی اور تاریخی پس منظر سے ناواقف ہیں اور متعلقہ قبائل اور سردارانِ قبائل کی روایتی اور نفسیاتی جکڑ بندیوں کا ادراک نہیں رکھتے، شاید وہ اربابِ اقتدار کی ان لن ترانیوں پر یقین کر لیں، اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ واقعی بلوچستان کے مظلوم قبائلی عوام کے جسموں اور ذہنوں پر پڑی ہوئی استحصالی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں اور وہ ایک صدیوں پرانے سماج سے رہائی پا کر ایک جدید سماج میں داخل ہو

رہے ہیں ۔ جب کہ درحقیقت ایسی کوئی ارتقائی تبدیلی واقع نہیں ہو رہی ۔محض چند ابن الوقت اور موقع پرست گماشتوں میں سیاسی رشوت کے طور پر دولت تقسیم کرنے اور شہری ماحول کے پروردہ یا شہری ماحول سے ذاتی عیش ونشاط کی حد تک استفادہ کرنے والے لوگوں کو راتوں رات منزل مراد سے ہمکنار کرنے کا عمل سماجی ارتقائے عمل کا مترادف ہرگز نہیں ہوسکتا ۔ لاکھوں کی تعداد میں جو لوگ سرقبیلوی نظام کے ہاتھوں بھوکے ننگے اور زندگی کی عام سہولتوں سے محروم چلے آ رہے ہیں، وہ انتہائی شدائد وآلام کا شکار ہونے کے باوجود اسی حال میں ہیں ۔خوشحالی اگر میسر آتی ہے تو ان لوگوں کو، جو پہلے سے عوام کی بہ نسبت زیادہ خوشحال تھے اور جو سیاسی سودے بازی کا فن تھوڑا بہت جانتے تھے ۔ایسے لوگ معاشی اعتبار سے پہلے کے مقابلے میں بہت بلند ہو گئے ہیں ۔ بالفاظ دیگر خوشحالی اور بدحالی کا فرق زیادہ نمایاں ہو گیا ہے جسے ارتقائی مدارج کا نام دینا سراسر حماقت اور لغویت ہے ۔'' (4)

ہر زمانے کی طرح آج بھی بلوچستان کی صوبائی کابینہ میں وزیراعلیٰ سمیت 70 فیصد سے زائد وزیر، سردار اور جاگیردار ہیں مگر کسی نے ان کے طبقاتی کردار اور طبقاتی پس منظر کے بارے میں کچھ نہ لکھا مگر ملک محمد پناہ اس بنیادی نقطے ہی پر اپنا سیاسی تجزیہ استوار کرتے تھے ۔ان کا گز ہی آج کے ہمارے سیاسی تجزیہ نگاروں کے گز سے مختلف تھا۔کتنی خوبصورت بات کہہ گئے ہیں وہ؛

''آج صوبے کا انتظامی سربراہ سرداروں کا سردار (خان قلات) ہے اور وزارت اعلیٰ پر بھی ایک سابق والی ریاست فائز ہیں اور سینئر وزیر سب سے بڑے قبائلی سردار ہیں جو بیداری پیدا کرنے والے عوامل کو بندوق کے زور سے نہیں بلکہ بدعنوانیوں کے ذریعے پیچھے دھکیلنے کے لئے کوشاں ہیں ۔'' (5)

اب آیئے بابو کے کارڈ کی طرف ۔ہم اگست 1975ء کے کارڈ کا صرف ایک حصہ ہی پڑھ سکتے ہیں جہاں اوپر سبز سیاہی میں لکھا ہے......

Greeting on 28th Anniversary of Pakistan.

14th August 1975

بائیں کونے پر پاکستان کا جھنڈا ہے ۔اور اس کے ساتھ ہی سرخ روشنائی میں یہ جملہ لکھا ہے؛

Live with Peace and Prosperity

تھوڑا نیچے کر کے انہوں نے پاکستان کی مختلف قومی زبانوں کا معجون بنا کر اپنا یہ نعرہ نما دعائیہ شعر لکھا ہے؛

آزاد بہ بیت، آباد بود، داوطن ،ہمارا پاکستان
نال امن و ترقی پنجاب، سرحد، بیوسندہ، بلوچستان

ساتھ میں انگریزی ترجمہ موجود ہے؛

May long live evergreen Pakistan

with Punjab,Sarhad,Sind and Balochistan

اُدھر ملک محمد پناہ بلوچستان کی ترقی کے مطالبات پر مشتمل اپنے اداریے جاری رکھے ہوئے تھے ۔9 اگست والے شمارے میں انہوں نے اپنے اداریے کا عنوان ''ریلوے کی توسیع'' رکھا؛

''اقتصادی ترقی کے لئے صوبے کے پیداواری وسائل کو ترقی دینا ناگزیر ہے ۔معدنی اور زرعی شعبوں کے علاوہ مویشی پالنے اور چھوٹی صنعتوں کے ساتھ ساتھ یہاں دستکاریوں کو فروغ دینے سے ہی اقتصادی خود کفالت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے ۔معدنیات سے صرف ان علاقوں میں استفادہ کیا جارہا ہے جہاں ریلوے کے ذریعے ان کی نقل وحمل کا ذریعہ موجود ہے ۔اسی طرح زرعی پیداوار اور باغات کا علاقہ بھی انہی علاقوں تک محدود ہے جن کے قرب وجوار میں ریلوے اور پختہ سڑکوں کے ذریعے مقامی اور ملکی منڈیوں تک رسائی کی سہولت میسر ہے ۔ باقی تمام علاقوں میں معدنیات زمین کے سینے میں دفن ہیں ۔

''اور اندرونِ بلوچستان بہت سی زرخیز وادیاں کاشت سے محروم ہیں ۔اگر زرخیز وادیوں کو سیراب کرنے کے لئے آبپاشی کا مستقل انتظام کر کے زرعی اجناس پھلوں اور سبزیوں وغیرہ کی کاشت کو فروغ دیا جائے تو یہ سب کچھ اس وقت تک ایک رائیگاں کوشش ہوگی جب تک کہ ان کی نقل وحمل کے لئے ریلوے موجود نہ ہو۔گویا اقتصادی خود کفالت کی منزل تک پہنچنے کے لئے یہاں ریلوے کی تعمیر ایک ناگزیر امر انتہائی اہم ضرورت ہے ۔'' (6)

بابو کے 1975ء کے ایک کارڈ کا صرف ایک طرف پڑھا جاسکتا ہے۔ جس پہ بابو کے بیٹے 'جہاں وش کی پیدائش کی خبر ہے۔ بائیں طرف بچے کی تصویر ہے اور اوپر وہی مخصوص شاعری میں لکھا ہے؛

جھـــاں وش کـــریـــم،وشیـــں ســـلام

امـــن دوستـــان لـــه مبـــارك مـــدام

A Sweet Salam with Best Wishes

From Jahan Vash to Peace Lovers

نیچے انگریزی میں اس کی پیدائش کا لکھا ہے؛

Jahan Vash Karim Born on Saturday

جناب ایوب بلوچ قصہ سناتے ہیں کہ بابو ایک جگہ بیٹھے اپنے بیٹے کے نام کے متعلق باتیں کر رہے تھے کہ ایک اور دوست نے اپنے بیٹے کی پیدائش کی خبر سناتے ہوئے بابو سے فرمائش کی کہ اُن کے بیٹے کا نام بھی بابو ہی رکھیں۔ بابو نے کہا ''اس کا نام رکھو دل وش۔'' اس صاحب نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ آپ اپنے بیٹے کا نام ''جہاں وش'' رکھتے ہیں اور میرے بیٹے کا نام محض 'دل وش۔ تو بابو نے جواب دیا؛ ''میرا بیٹا عبدالکریم امن کا بیٹا ہے۔ اس کی پیدائش پر بجا طور پر ایک پوری دنیا خوش ہوگی۔ میرا بیٹا پوری دنیا کے لئے امن اور ترقی کے لئے کام کرے گا۔ جبکہ آپ اپنے بیٹے کی پیدائش پر اپنے ہی دل میں مسرتیں منائیں۔''

معلوم نہیں اب جبکہ بابو دنیا میں نہیں ہیں، ان کی آدرشیں تباہ و برباد ہوگئی ہیں، بلوچستان کا امن فوجی آپریشنوں کا یرغمالی بن چکا ہے اور عالمی امن پورے امن کیمپ کی تباہی پر منتج ہو چکا ہے ،تو اس صورت میں جہاں وش خود کو جہاں وش ثابت کرے گا یا پھر محض دل وش بن کر رہ جائے گا۔

اکتوبر 1975ء کے کارڈ میں ایک طرف عید مبارک لکھا ہے جس کے نیچے یہ جملے ہیں؛

عید مبارک؛ 7 اکتوبر 1975ء

گـــوں نیـکیـــں واھـگـــاں شـــمـارا مبـارك

پـــه امـــن و امـــان عیـــد مبـــارك

مخلص کریم امن

کارڈ کی دوسری طرف دائیں جانب ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کی تصویر کے اوپر نیچے یہ تحریر موجود ہے؛

''روزِ یادآوری

21 اکتوبر 1975ء

دبلوچستان گران قدر!

مرحوم ملک عبدالرحیم خواجہ خیل کی دسویں برسی منائی جائے گی۔''

بائیں جانب وہی مخصوص مونوگرام اور اس کے اوپر کی گئی شاعری یوں ہے؛

مشـــونـــا امیـــد اچ وتـــی امـــن ءِ کـــار

کـــه دے اَس بـــروھـــے امـــن ستـــاپـــه وار

Never be dishearted from your peace mission

The day must come when people follow my ambition.

بابو! بالکل ایسا ہی ہے۔ البتہ ہمارا یہ پختہ ایمان ہے کہ امن، سب سے بڑے جنگ باز یعنی ''سرمایہ داری نظام'' کی تباہی پر ہی قائم ہو سکے گا۔

اُدھر ستمبر 1975ء کو دو سال تک بند رہنے کے بعد ہفت روزہ ''عوامی جمہوریت'' ایک بار پھر شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے ڈیکلریشن کو معطل کر دیا گیا تھا جو طویل مقدمہ بازی کے بعد بحال ہوا۔ یہ رسالہ پاکستان میں محنت کش تحریک کا ترجمان تھا۔ اس کا ذکر ہماری تاریخ کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس نے اپنی غیر حاضری کے دوران پاکستان کے ملکی حالات پر ایک ہی نقطے میں خوبصورت تبصرہ کیا؛ ''اس دوران پاکستان کی سیاست میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کی سیاست نے افسوسناک صورتحال پیدا کر دی تھی۔ حکومتی پارٹی اور متحدہ جمہوری محاذ کی جنگ محض اقتدار کی جنگ تھی۔ متحدہ جمہوری محاذ محض جمہوریت کے نعرے لگا تا تھا اور حقیقی مسائل مثلاً جاگیرداری کے خلاف ایک بھی بات نہ کرتا تھا۔ اسی طرح حزب اقتدار عوام کی نمائندگی کی دعویدار ہونے کے باوجود اس مفاد پرست اور استحصالی نظام کی پرورش کر رہی ہے۔''(7)

بابو کے نوکیں دور کے پیڈ پر (جس پہ حسب معمول ان کی تصویر کیساتھ کارڈوں والی

شاعری چھپی ہوئی ہے) ہمارے اس بلوچ وزیر خارجہ کے نام سے عظیم اکتوبر انقلاب کی 58ویں سالگرہ کے ٹیلی گرام کی کاپی اب بھی محفوظ ہے۔

انگریزی اور جملے اُن کے اپنے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے......

His Excellency ambasador of USSR Islamabad. Kindly convey my best wishes with heartiest congratulations on occasion of 58th anniversary of Great October Revolution to USSR leaders and peoples.

May be great October Revolution sucsessful in the World peace ,human friendship and prosperity.

Karim Amn

Hazarganji Balohistan

Pakistan P.O.58, Quetta

بابو کے 1976ء کے کارڈوں میں دلچسپی کا کافی مواد موجود ہے۔ انہیں اپنے کارڈوں سے بڑی محبت تھی۔ یہی کارڈ تو ان کا پیغام، ان کا لائحہ عمل اور ان کی عزتِ نفس تھے۔ اُس برس کا اولین کارڈ یعنی یکم جنوری کے کارڈ کے ٹکڑوں کو گوند کے ذریعے دوبارہ جوڑ دیا گیا ہے اور اس کے نیچے سبز سیاہی سے بابو کی اپنی تحریر میں یہ عبارت درج ہے:'' یہ اُس کارڈ کا فوٹو سٹیٹ ہے جسے........... نے 27 دسمبر کو کیفِ ڈان کوئٹہ میں پھاڑ کر پیروں کے نیچے روند ڈالا تھا۔'' کریم امن ہزار گنجی۔''

یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ ایک بزرگ شخص ہر وقت کارڈ چھاپتا ہے اور اسے مخصوص لوگوں کے سرکل میں بیچتا ہے تو یقیناً ایک موقعہ ایسا ضرور آتا ہے کہ کوئی گاہک اپنی بیزاری کا اظہار کر بیٹھے اور شاید غصہ اس قدر زیادہ ہو کہ آدمی فیوڈل ردعمل میں اس کارڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ مگر جب اس کارڈ پہ درج پیغام کو پڑھا جائے تو بہر حال حیرت ہوتی ہے کہ اس میں ایسی کیا بات تھی جس کی بنا پر کارڈ کو پرزہ پرزہ کر کے پیروں تلے روندا جائے۔

کارڈ کے اوپر مکتوب الیہ کو اس انداز سے مخاطب کیا گیا تھا:

''بخدمت محبی جناب۔۔۔Dear Sir''

(ملاحظہ فرمایئے بلوچ معاشرہ ہے جہاں رشتے بہت ہی محدود ہوتے ہیں۔ وہاں ایک شخص ''محبی'' اور ''Sir'' کہہ کر پکار رہا ہے۔ ایسا شخص جو اپنی پوری زندگی ''سر، آقا، جناب عالی اور فیض گنجور'' کہنے کا کم ہی مرتکب ہوا ہو اور ایک ایسے معاشرے سے تعلق رکھتا ہو جہاں آپ یا صرف ''محبی'' ہو سکتے ہیں یا پھر ''زہر آلود دشمن''۔ وہاں ایک پڑھا لکھا، دکھوں اور دھوکوں کا شکار معمر شخص کس تکریم سے آپ کو مخاطب کر رہا ہے!)۔ یہی نہیں، وہ تو اپنی ہفت زبانی دعا بھی ساتھ دے رہے ہیں، ایک شخص کو نہیں، ایک ملک اور خطے کو نہیں، پوری لولاک کو:

مبــــارك امــــن دوستـــــاں ســـــال شـــــش......

پـــــه امــن و شيـگـــڑه دا ســـال دو شـــش...... 1976

My Best greeting to world peace lovers

may new years be peace and joyful year.

کارڈ کے نچلے حصے پر حسب سابق وہی شناسا فقرے ہیں، البتہ بائیں جانب نیچے کی طرف بابو ہاتھ فضا میں بلند کئے کھڑے ہیں اور اوپر اردو اور انگریزی میں یہ فقرہ درج ہے۔

''امن سے فلاح و بہبود ہو مقصود''

Build up peace for prosperity

بابو زبردست آدمی تھے۔ بلوچستان میں ان جیسے بلند قامت انسانوں کی پھیلائی ہوئی روشن خیالی، ترقی پسندی اور جمہوریت کے تصورات قائم ہوئے۔ مگر چونکہ بابو اپنی پارٹی' مزدوروں کسانوں کی پارٹی کو مضبوط نہ کر سکے اس لئے ان کی ساری محنت کا ثمر پھر اوپری طبقہ اچک کر اُن سے لے گیا۔ کوئی حزب اقتدار بنا، کوئی اختلاف۔ دونوں طرف بابو کی فکر پر مشتمل فقرے دہرائے جاتے تھے اور بابو اپنے دیگر ہم خیال دانشوروں کے ساتھ اس بات پہ خوش تھے کہ ان کا نظریہ، ان کا فلسفہ پھل پھول رہا ہے۔ یہ غلط فہمی صرف بلوچستان میں نہ تھی، یہ ملکی بلکہ عالمگیر مسئلہ تھا۔ اپنا نظریہ اور اپنی سیاست دوسرے طبقات کے ہاتھ میں دے کر گویا اپنا ہتھیار، بورژوازی کے حوالے کرنا تھا۔ یہ بات بلوچستان کی بورژوا سیاسی پارٹیوں پر بھی صادق آتی ہے اور مرکزی سطح پر بھی۔ اس

بات کا بابو کو بھی تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ مگر اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ یاروں نے انہیں 'مجنوں' کا خطاب عطا کر دیا تھا اور ان کا ''نوکیں دور'' بند ہو چکا تھا۔ مگر ان کی ترجمانی ہوتی رہی جس کا لب لباب ہفت روزہ 'عوامی جمہوریت' کے ایک ہی فقرے میں بیان کیا جا سکتا تھا کہ؛

''پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت کی طبقاتی بنیاد، اس کا سیاسی عمل اور اس کا سیاسی ماضی سوائے اس بات کے کسی اور طرف اشارہ نہیں کرتا کہ یہ پارٹی ایک نئے اسلوب سے پرانے جاگیرداری سرمایہ داری معاشی ڈھانچے کو سامراجی پشت پناہی سے قائم رکھنے کے سوا کوئی دوسرا نقطہ نظر نہیں رکھتی۔'' (8)

یہی بات ہی صحیح بات تھی اور اس صحیح بات کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اس وقت پیپلز پارٹی کو سامراج دشمن، جاگیردار دشمن اور جمہوری پارٹی سمجھ کر ووٹ دیا تھا انہوں نے سخت غلطی کی تھی۔ یہی بات آج بھی صحیح ہے اور اس صحیح بات کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے 1993ء اور بعد میں مشرف والے الیکشن میں پیپلز پارٹی کو سیکولر، جاگیردار دشمن اور جمہوری پارٹی سمجھ کر ووٹ دیا تھا انہوں نے سخت غلطی کی تھی۔

اوپری طبقہ اپنی چالاکی اور عیاری اور کلاکاری سے ایسی ایسی چالیں چلتا رہا کہ اس میں لوگوں کے ساتھ ساتھ دانشور اور پڑھا لکھا گروہ بھی دھوکا کھا گیا۔ دانشوروں نے تو سارا مسئلہ بگاڑ دیا۔ انہوں نے ان بورژوا سیاسی پارٹیوں کی تعریف و توصیف میں شاہی درباروں والے درباری دانشوروں کا کردار ادا کیا۔ عجیب عجیب اصطلاحات گھڑیں، خوبصورت فقرے بنائے اور ان پارٹیوں کے مسخ شدہ چہروں پر اپنی دانشوری سے بنا ہوا ماسک چڑھا کر انہیں توقیر عطا کر دی۔ مگر اصل صورتحال یہ تھی کہ وہ پارٹیاں، وہ سیاست اور وہ پارلیمنٹ جاگیرداروں، سرداروں اور ملاؤں ہی کی تھی......؛ ''پاکستان کی قومی اسمبلی نے اس ملک کا بنیادی دستور بنایا جسے اس قومی اسمبلی میں موجود مختلف سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں نے اتفاق رائے سے منظور کیا ہے اور جن سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں نے اس آئین کو منظور کیا وہ سیاسی پارٹیاں پاکستان کے موجودہ معاشی نظامِ پیداوار کی حامی ہیں کیونکہ اس آئین نے ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کو قائم رکھا ہے اور نجی ملکیت کے معاشی

نظام کو قائم رکھنے والی سیاسی پارٹیاں اور کچھ بھی ہو سکتی ہیں مگر وہ ان طبقات کی نمائندہ نہیں ہو سکتیں جو نجی ملکیت کے اس معاشی نظام میں استحصال کا شکار ہیں اور ذرائع پیداوار کی ملکیت سے محروم ہیں۔ وہ طبقات پاکستان کے محنت کش یعنی مزدور اور کسان ہیں۔'' (9)

آج بھی ہماری پارٹیاں، آج کی سیاست اور آج کی پارلیمنٹ جاگیرداروں، سرداروں اور ملاؤں کی ہے اور فوج اور بیوروکریسی انہی تینوں کی خدمت گزار ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نہ تو مزدوروں کسانوں سے مخلص تھیں نہ عورتوں کی حالت کو سدھارنا چاہتی تھیں اور نہ ہی سماج میں کوئی بنیادی تبدیلی لانا چاہتی تھیں۔ اُن کے خاوند تو اُن سے بھی ہزار برس پیچھے ہیں۔ اسی طرح میاں نواز شریف نہ تو جاگیرداری ختم کر کے سرمایہ داری لانا چاہتے ہیں اور نہ ہی سیکولر اور جمہوری کلچر کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔ بلوچستان کی ساری بورژوا پارٹیوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ پارٹیاں اسی نظام کو برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ اور اس نظام میں عام انسان کی تعلیم، صحت، رہائش اور روزگار کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ جبکہ انسان کی یہی موٹی موٹی ضرورتیں ہیں۔ بلوچستان کی کسی بھی پارٹی کے پروگرام میں عوام کی ان ضرورتوں کی ضمانت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ (ہم سیاسی ضرورتوں کی بات ہی نہیں کر رہے)۔

اُدھر بابو نے دو کارڈ یکے بعد دیگرے 5 اور 7 اپریل 1976ء کو شائع کئے۔ 5 تاریخ کے کارڈ میں عظیم جمہوری مبارز جناب میر عبدالعزیز کرد کی خوبصورت تصویر ٹائی اور ھیٹ کے ساتھ چھاپی، جس کے نیچے میر صاحب کا نام لکھا۔ اوپر کے الفاظ یوں ہیں؛

''بلوچستان ءِ مزن نامیں عزت مند حدامرزی میر عبدالعزیز کرد۔ 5 اپریل 1976ء ءَ آئی وفات ءِ ہفتمی ایں سال روچ مستنگ ءَ گواز ینگ بوت۔''

تصویر کے دائیں بائیں طرف شعر کے دونوں مصرعے لکھے ہیں؛

بلوچستان تراهچبرنه خواهد کرد فراموش

اور بائیں جانب؛

که اوستاتے خلیك هردم ستاد یاد و جوش

کارڈ کی دوسری جانب ہزار گنجی والی ان کی مخصوص تصویر ہے جس کے اوپر لکھا ہے؛

اگر خواهی که باشی دوست هرکس

پـه امـن و دوستی ٹاهیت گوں هرکس

If you like to be human friend,

so you adopt goodman's trend.

7اپریل1976ء کا کارڈ بھی عظیم پیغام لئے ہوئے ہے۔ اس میں ایک خوبصورت، باریش، بردبار شخص کی تصویر چھپی ہوئی ہے جس کے نیچے اس شخص کا نام درج ہے؛

مرحوم میر جعفر خان جمالی، روجھان جمالی، نصیر آباد، بلوچستان۔

تصویر کے اوپر بابو اس شخص کے بارے میں یوں تاکید کرتے ہیں؛

پـه ڈیهـه و قـوم ء کـاران عـالـی

مـدام زنـده بـئے میـریـں جـمـالـی

خدا مرزی ایں جعفر خان جمالی ہمی ایں یاتی ایں روش 7اپریل1976ء مہ شموشت۔

عوامی جمہوریہ چین کے مدبر اور لیڈر جناب چو این لائی کی موت پر بابو کا ٹیلی گرام ملاحظہ ہو؛

''9جنوری1976ء

ہزایکسیلنسی سفیر جمہوریہ چین، دراسلام آباد

براہ کرم وزیراعظم چو این لائی کی غمناک موت پر میرے گہرے صدمے ان کے خاندان اور جمہوریہ چین کو بھجوادیجئے۔ ان کی روح کو چین نصیب ہو۔

کریم امن، ہزار گنجی، بلوچستان۔''

یہ بہت ہی اعلیٰ انسانی کام تھا۔ مفلسی، اور گمنامی کے باوجود دنیا کے غم اور خوشی میں حصہ لینا بابو کی بہت اچھی عادت تھی، اسے اپنانا چاہیے۔ دنیا میں شامل رہنا چاہیے۔ اچھی عادتوں میں دنیا بھر کو مبتلا کردینا چاہیے۔

اُدھر بابو کے دوسرے ساتھی بھی اپنے اپنے مورچے پہ ڈٹے فلاح کے مشن میں جتے ہوئے تھے۔ برائیوں کی نشاندہی کرنا اور اُن کے خلاف عوام الناس کو باخبر رکھنا گویا ہمارے بزرگوں کا اہم ترین مقصدِ حیات تھا۔

اسی اثنا میں بھٹو صاحب نے ایک اور لطیفہ برپا کردیا۔ وہ بلوچستان کے طویل دورے

کے بعد 18 اپریل 1976ء کو کوئٹہ میں ایک جلسہ عام منعقد کرتے ہیں اور اس میں بلوچستان میں سرداری نظام کے خاتمے کا اعلان کرتے ہیں۔ اسی روز صدر مملکت کی طرف سے اسی مضمون کا آرڈیننس جاری کیا گیا جس کی رُو سے سرداری نظام کو ممنوع قرار دیا گیا۔ گویا سرداری نظام نہ ہوا، جوار کی روٹی ہوگئی، کُن کہا اور فیکون ہوگیا۔ نہ بے زمین عوام کو زمینیں دی گئیں، نہ چراہ گاہوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا، نہ انتظامی اصلاحات کی گئیں، بس تعریفوں میں اس کارنامے کو بھی شمار کرتے رہے۔ ملک محمد پناہ نے اسے بہت خوبصورت سرخی دی؛ ''پروپیگنڈہ ہی پروپیگنڈہ۔'' انہوں نے لکھا کہ؛ ''سرداروں کو جملہ مراعات واختیارات سے محروم کردیا جائے۔ ان کے ماہانہ وظیفے کو ختم کردیا جائے۔ سرداروں کے پاس موجود قطعات اراضی کو قومی ملکیت میں لے کر پورے قبیلے میں بانٹ دیا جائے۔ زرعی پیداوار اور مال مویشی میں سردار کے ٹیکس کا خاتمہ ہو۔ انتظامی اور عدالتی اختیارات کے ذریعے لوگوں سے جرمانے کی وصولی سے سردار کو روکا جائے، مالی، بجار، پرس کے نام سے ٹیکسوں کی جبری وصولی نہ کرنے دی جائے۔'' مگر یہ سب کام نہ بھٹو صاحب نے کئے، نہ ضیا، جونیجو، بے نظیر، نواز شریف، پھر بے نظیر نے اور پھر نواز شریف اور اس کے بعد نہ ہی جنرل مشرف نے کئے اور نہ آصف زرداری کریں گے۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ سرداری نظام کے خلاف باتیں کرتے نہیں تھکتے۔

بلوچستان کی معیشت زرعی اور بھیڑ پال ہے۔ بلوچستان کی اکثر آبادی چرواہی معیشت سے وابستہ ہے اور آبادی کا جو حصہ کاشتکاری کرتا ہے۔ ان میں چھوٹے مالک کسان بھی ہیں، مزارعے اور کھیت مزدور بھی، طریقۂ کاشت فرسودہ اور دقیانوسی ہے۔ بیشتر اراضی بارانی ہے۔ کہیں کہیں کاریز اور ٹیوب ویل سے آبپاشی کی جاتی ہے۔ بلوچستان میں بڑی بڑی چراگاہیں ہیں اور ان چراگاہوں میں مویشی پالے جاتے ہیں۔

پہلا اور لازمی قدم یہ ہونا چاہئے تھا کہ بلوچستان میں زمین پر مروج ملکیت کے قانون کو یکسر ختم کردیا جاتا تا کہ غیر حاضر مالکان مزارعوں کا استحصال نہ کرسکتے۔ اسی طرح چراگاہوں کی حفاظت کی جانی چاہئے تھی۔ بہتر نسل کے مویشی رکھوائے جاتے اور پشم، گوشت، گھی اور کھالوں سے

متعلق صنعتیں کو آپریٹو بنیاد پر لگائی جاتیں اور وسیع جمہوریت مروج ہوتی۔

بلوچستان کے معاشی نظام کو بنیادی طور پر بدل دینے سے ہی بلوچستان میں نیا سماج وجود میں آتا۔ پرانی اقدار، روایات اور توہمات ختم کی جاسکتی تھیں۔ مگر ایسا کرنا بھٹو صاحب کے پروگرام میں تھا ہی نہیں۔ ایسا کرنا کسی بھی بورژوا سیاسی لیڈر کے پروگرام میں نہیں تھا اور نہ اب وہ ایسا کرنا چاہتے ہیں۔

نوکیں دور کے ایڈیٹر بابو عبدالکریم امن نے 7 مئی 1976ء کو جو کارڈ چھاپا اس پر یہ فقرے قلم سے لکھے ہیں؛

''جناب-----

7 مئی 1976ء سے میزان مارکیٹ کوئٹہ کے سامنے سوئی گیس پائپ لائن انڈس گیس کے ساڑھے چار فٹ گہرے گڑھے میں گر کر بائیں جانب کی چار پسلیوں کے فریکچر کی وجہ سے گھر میں زیرِ علاج بسترِ علالت پر ہوں۔''

کریم امن''

جب پاکستان اور بھارت کے درمیان شملہ معاہدہ ہوا تو بلوچستان کا یہ دانشور اور سیاسی کارکن اس سے کہاں لاتعلق رہ سکتا تھا۔ چنانچہ 15 مئی 1976ء کو ہمارے ترجمان جناب عبدالکریم امن نے اردو میں بھٹو صاحب کو یہ ٹیلیگرام بھیجا؛

''جناب ذوالفقار علی بھٹو، وزیر اعظم پاکستان

السلام علیکم!

''شملہ سمجھوتہ کی روشنی میں پاک بھارت کا نیا سمجھوتہ مبارک۔ نیک تمناؤں کے ساتھ دعا ہے کہ ہر جہت سے تعلقات کامیاب، مستحکم اور دیرپا رہیں۔ آمین۔

کریم امن، ہزار گنجی، بلوچستان''

مگر ہم سب اس بات کے گواہ ہیں کہ اس سمجھوتہ کے باوجود دونوں طرف کے لیڈر آج تک تعلقات بہتر نہ بنا سکے۔ دونوں ممالک کے عوام تو دوستی، بھائی چارے اور اچھی ہمسائیگی کے

تعلقات چاہتے ہیں مگر ہر بار ہمارے سربراہانِ مملکت ایک سیاسی کارڈ کے بطور ایک دوسرے کے خلاف حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔

بابو کی طرف سے بھٹو صاحب کو 7 جون 1976ء کو روانہ کردہ ٹیلیگرام کچھ یوں ہے؛

''جناب ذوالفقار علی بھٹو، وزیر اعظم پاکستان، پشاور

''نیک تمناؤں کے ساتھ ساتھیوں سمیت جمہوریہ افغانستان کے خیر سگالی دورے پر خدا حافظ۔ بہ سلامت روی و بازآئی۔ دعا ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے برادرانہ تعلقات استوار، مستحکم اور دیرپا رہیں۔

کریم امن، ہزار گنجی، بلوچستان''

8 جون کا کارڈ بڑا دلچسپ ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو اور سردار محمد داؤد کی گپ شپ میں مصروف تصویر ہے۔ دائیں طرف بابو نے انہیں پاکستان کا دورہ کرنے پر خوش آمدید کہا ہے۔ تصویر کے اوپر اس عظیم انسان نے 20 سال قبل جو دعا کی تھی، وہ کمیونسٹوں کا ہمیشہ سے پڑوسی ممالک کے لئے موقف رہا ہے۔ خواہ تخت پر داؤد جیسا ظالم بیٹھا ہو یا عوامی اقتدار محترم نور محمد ترہ کی کے سپرد ہو؛

کریمءِ دعا انت مدام بہ اوشتی
د افغان و پاك دا مینه دوستی
به جهد ،امن و آشتی و نیکی
مدام قائم دائم مرے ایلمی

مگر جو دلچسپ بات اس کارڈ میں ہے وہ یہ ہے کہ یہ کارڈ بھی پرزہ پرزہ کیا ہوا ہے اور دوبارہ گوند سے جوڑ کر نیچے یہ عبارت قلم سے لکھی ہوئی ہے؛

''یہ وہ کارڈ ہے جب میں نے 21 اگست 1976ء کو بوقت عصر-----کو ان کے دفتر-----کے سامنے دے دیا۔ تو نہ معلوم وہ اتنے طیش میں آگئے کہ انہوں نے اسے پھاڑ کر مجھے واپس دیدیا۔ اس وقت-----،-----، اور-------بھی ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

کریم امن ہزار گنجی، بلوچستان۔ پاکستان''

اکتوبر 1976ء کے کارڈ کا سائز باقی کارڈوں کی نسبت بڑا ہے۔ دائیں طرف ملک

عبدالرحیم خواجہ خیل کی تصویر ہے۔ بائیں جانب ایک سفید ریش بزرگ کی تصویر ہے۔ کارڈ کے اوپر اردو میں سرخی لگائی ہے؛ ''روزِ یاد آوری''۔ اس کے سامنے انگریزی میں لکھا ہے۔

Memorial day 21st October 1976

نیچے کی تحریر یوں ہے؛ ''بلوچستان کے نامی گرامی ملک عبدالرحیم خواجہ خیل مستنگ، کی گیارہویں برسی 21 اکتوبر 1976ء کو ہزار گنجی بلوچستان پاکستان میں منائی جائے گی۔''

واہ رے ہمارے بزرگ، ہمارے بابو بادشاہ۔ فوت ہوئے خود آپ کو کتنے برس بیت گئے، کون آیا ہزار گنجی آپ کو سلام کرنے؟ خواجہ خیل صاحب کے پاس کوئی کیوں جائے؟۔ وہ نہ ہشت ہزاری ہیں، نہ سر، نہ خان صاحب، نہ بیگلر بیگی۔ پھر ایسا بھی نہیں ہوا کہ انہوں نے اپنی زندگانی میں کسی بے اولاد جوڑے کو کرامت کے ذریعے نرینہ اولاد عطا کی ہو، کسی دیوار پر چڑھ کر اسے سواری کی جگہ پر استعمال کر کے میلوں کی مسافت سیکنڈوں میں طے کی ہو۔ انہوں نے تو کبھی کرامت والا خواب بھی نہیں دیکھا تھا جس کی تعبیر سچ ثابت ہوئی ہو۔ وہ تو بس قاضی عبدالصمد سربازی کے بقول؛

چه گوئم ز اخلاق آں خواجه خیل
که سوی خرابی نمی داشت میل
زاوصاف آں بطل عبدالرحیم
غیوروجسور و شریف و کریم
به تحریكِ تحریر و ملك ووطن
سپه دارو جانباز باجان و تن
به یك انجمن صدر و هم سرپرست
نداده روایات ملی زدست
کشیده زهر گونه رنج و محن
به همراه یاران بحب وطن
مسلط دراں عهد بوده فرنگ
که چنگال او تیز تر از پلنگ
بیا مردی خویش به استوار

بهر حال پابندِ قول و قرار
بخاطر قوی، هم به همت بلند
ز خلق ستوده شد دل پسند
ز خوبی بسے داشت اندر وجود
چو مرد آن نامی دریں هست و بود
ولے حیف از گردش روزگار
که دائم بحالے ندارد قرار
بشد انتقالش بدارالبقا
که دنیا تهی دامن است ازوفا
بداده به احباب داغ فراق
به یاران جدائی از و گشت شاق
خدایا تو هستی غفورو رحیم
به بخشائے بهر حال عبدالرحیم

بابو نے اس لمبی نظم کو کارڈ پر بہت خوبصورتی سے ٹھونس کر جگہ دی ہے۔ آخری دو شعر یوں ہیں؛

بگفتم من ایں برزبانِ دری
به فرمائش کامل القادری
که ایں نظم نذرے زسربازی است
نخستیں دریں معرکه غازی است

(نذرانه عقیدت)

اسی کارڈ میں سفید ریش بزرگ کی تصویر کے ساتھ لکھا ہے؛

''مرحوم قاضی عبدالصمد سربازی صدر مجلس شوریٰ قلات جو 7 ستمبر 1974 کو وفات پا گئے۔''

بابو نے عظیم اکتوبر سوشلسٹ انقلاب کے موقع پر سات نومبر 1976ء کو سوویت سفیر کو اِس مضمون کا ٹیلیگرام روانہ کیا؛

''براہِ کرم کامریڈ پوڈ گورنی صدر، کامریڈ کو سیجن وزیر اعظم، کامریڈ گرومیکو وزیر خارجہ، اور سوویت سپریم کونسل کے ممبر کامریڈوں کو عظیم اکتوبر انقلاب کی 59 ویں سالگرہ کے موقع پر

میری طرف سے پرخلوص اور دل کی گہرائی سے مبارکباد کہہ دیں۔ میری تمنا ہے کہ آپ کو اکتوبر انقلاب کے مقاصد سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہو۔ عالمی امن اور خوشحالی کے مقاصد کیلئے اتحادی اور دیگر اقوام کے ساتھ دوستی اور تعاون کا خواہشمند۔۔۔۔۔کریم امن۔ ہزار گنجی۔ بلوچستان''

یہ وہ زمانہ تھا جب بابو کے بعد والی نسل اُن کے نقشِ قدم پر چلتی آ رہی تھی۔ اسی سال اکتوبر انقلاب کی سالگرہ بلوچستان میں باقاعدہ منائی بھی گئی۔ ہفت روزہ عوامی جمہوریت کے 23 نومبر 1976ء کے شمارے کے صفحہ نمبر تین پر ایک اجلاس کی خبر موجود ہے؛''9 نومبر کو سوشلسٹ سٹوڈنٹس آرگنائزیشن بلوچستان کا ایک اجلاس اکتوبر انقلاب کی 59 ویں سالگرہ کے بارے میں منعقد ہوا۔''

بابو نے 17 نومبر 1976ء کو روسی سفارتخانہ کے ایک جوابی خط کو اپنے کارڈ پر چھاپا؛

''ڈیئر مسٹر کریم امن

ہز ایکسیلنسی سفیر کی ہدایت پر میں بڑی مسرت سے آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ عظیم اکتوبر انقلاب کی 59 ویں سالگرہ کے موقع پر کامریڈ برزنیف، کامریڈ پوڈ گورانی اور کامریڈ کوسیجن اور دیگر کامریڈز کے نام پر آپ کی بہت ہی مخلصانہ اور دلی مبارکباد ماسکو بھجوادی گئی۔

''ہماری تمنا ہے کہ آپ کے عظیم وطن کے لئے اور عالمی امن کے کاز کیلئے آپ کی مقدس خدمات کامیابی سے ہمکنار ہوں۔

مخلص

ڈاکٹر ایگور خالیونسکی

فرسٹ سیکرٹری''

آج تو ماسکو میں ریاستی اقتدار پر نہ کوئی کامریڈ براجمان ہے، اور نہ ہی اسلام آباد میں کوئی روسی سفیر اکتوبر انقلاب کی سالگرہ کی مبارک باد وصول کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، مگر بھوک، جہالت، بیماریاں اور جنگیں اسی طرح موجود ہیں اور ان کے خلاف جنگ کا میدان بھی موجود ہے۔ بلوچستان اور روس کے مابین انسانی مصائب کے خلاف جدوجہد کرنے کا مشترکہ مقصد

موجود رہا ہے اور موجود رہے گا۔ بابو کا مشن ابد تک قائم رہے گا، بابو کے پیروکار ہر عہد میں موجود رہیں گے۔ ان کو بغل گیر کرنے والا اسلام آباد میں موجود ہو یا نہ ہو۔ مگر اکتوبر انقلاب کی سالگریں تو منائی جاتی رہیں گی۔

17 نومبر 1976ء کو مولانا بھاشانی کا ڈھاکہ میں انتقال ہو گیا۔

مولانا 1885ء میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے خلافت تحریک میں حصہ لیا تھا، جس کی وجہ سے وہ 1923ء میں گرفتار ہوئے۔ جیل سے نکل کر وہ دہشت پسند تنظیم میں شامل ہو گئے اور 1924ء میں دوبارہ پکڑے گئے۔ انہوں نے 1932ء میں کسانوں میں کام شروع کیا اور جاگیرداروں کے خلاف زبردست طریقے سے جدوجہد کی۔

1932ء میں وہ مسلم لیگ میں شامل ہوتے ہیں جس کا نام بعد میں تبدیل کر کے عوامی لیگ بنا دیا گیا۔ 1952ء کی لسانی تحریک میں انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ 1957ء میں وہ عوامی لیگ سے علیحدہ ہو کر این اے پی بناتے ہیں۔ پھر ایک سال بعد ایوب خان نے برسر اقتدار آ کر انہیں گرفتار کر لیا۔ 23 مارچ 1970ء کو ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس پاکستان کی تاریخ میں اہم موڑ کا درجہ رکھتی ہے۔ اسی عظیم انقلابی موڑ کا تعین کرنے والی کسان کانفرنس کی صدارت مولانا نے کی۔ ملک ٹوٹا تو مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش کی سیاست کرنے لگے۔ مولانا ایک عظیم انسان تھے۔ فرقہ وارانہ سیاست کے خلاف تھے۔ وہ ایک عظیم محبِ وطن بنگالی تھے اور بالادست طبقات کے بہت بڑے دشمن تھے۔

ان کے انتقال پر بابو نے یہ ٹیلی گرام بھیجا؛

''18 نومبر 1976

ہز ایکسیلنسی سفیر بنگلہ دیش۔ اسلام آباد

ڈیئر سر!

براہِ کرم مولانا عبدالحمید خان بھاشانی کی المناک موت پر میری دلی تعزیت غمزدہ خاندان تک پہنچا دیجئے۔ خدا ان کی روح کو آرام دے اور امن دے۔

کریم امن

ہزار گنجی۔ بلوچستان''

1976ء کے دسمبر کے پہلے ہفتے میں بابو نے یکے بعد دیگرے چار کارڈ چھاپے۔ پہلے کارڈ کی ایک جانب نیچے کی طرف دائیں سے بائیں شہید خان عبدالصمد خان اچکزئی لکھا ہے، ساتھ میں شہید کی تصویر ہے۔ درمیان میں مرحوم محمد امین خان کھوسہ کا نام اور تصویر ہے۔ اور بائیں طرف بابو کی تصویر کھڑی ہاتھ ہلا رہی ہے۔ ان تصویروں کی قطار کے اوپر والی عبارت یوں ہے:

''بیادِ بلوچستان قومی اور عوامی رہنما، شہید خان عبدالصمد خان اچکزئی گلستان جو 2 دسمبر 1973ء کی رات کوئٹہ میں شہید کر دیے گئے۔

''اور مرحوم میر محمد امین کھوسہ عزیز آباد انڑواہ جیکب آباد جو 5 دسمبر 1973ء کو کراچی میں وفات پا گئے؛

In memory of second mercy day of Saheed Khan Abdul Samad Achakzai on 2nd dec. 1975 and Mir Muhammad Amin Khoso Azizabad Unnarwah Jacobabad on the 5th Dec.1975

مــنــی پُــرسـتـکـیـں سـلام پــہ شــمــا
مــدام بـــہ وی ژونــدی دقـــام راھــنــمـــا"

دوسرا کارڈ 2/3 دسمبر کا ہے جس میں عید الاضحیٰ کی مبارکباد بلوچی، پشتو، براہوئی اور انگریزی میں ہے۔ جو صرف ''امن دوستوں'' کے لئے ہے۔

تیسرے کارڈ پر 5/2 دسمبر 1976 کی تاریخ درج ہے جس میں دائیں سے بائیں تین تصویریں ہیں۔ دائیں جانب عبدالصمد خان ہیں۔ درمیان میں محمد امین خان کھوسہ اور بائیں جانب ایک سفید ریش بزرگ کی تصویر ہے جن کے نیچے لکھا ہے؛

''مرحوم مولانا عرض محمد بانی مدرسہ مطلع العلوم بروری روڈ کوئٹہ جو 31 اکتوبر 1971ء کو سیوی بلوچستان میں وفات پا گئے ہیں۔''

کارڈ کے اوپر بابو کی ہدایت ہے؛

Never forget them from your hearts. ''

جنہوں نے آپ کے انسانی حقوق کی خاطر خود کو قربان کر دیا۔''

1977ء کے کارڈ پر بابو نے دو ہستیوں کی تصاویر دی ہیں۔ دائیں جانب میر سلطان ابراہیم خان ہیں اور بائیں جانب جام میر نور اللہ خان۔ دونوں تصاویر کے درمیان ''روزِ یادآوری'' لکھا ہے جس کے نیچے لکھا ہے؛

''26 دسمبر کو میر سلطان ابراہیم کی سولہویں برسی اور 7 جنوری 1977ء کو جام میر نور اللہ خان کی 31 ویں برسی بلوچستان میں منائی جائے گی۔''

کارڈ کے اوپر کے نصف کے مندرجات یوں ہیں؛

"Mermorial Day 26
December.1976
and 7th January.1977"

''بلوچستان کے اولین قافلہ سالاروں یوسف عزیز مگسی، عبدالصمد خان اچکزئی، اور میر عبدالعزیز کرد کے رفقا، جام میر نور اللہ خان جو 7 جنوری 1946ء کو کوئٹہ میں اور میر سلطان ابراہیم قلات جو 26 دسمبر 1960ء کو چمن بلوچستان سے قندھار افغانستان جاتے ہوئے چمن اور قندھار کے درمیان تختہ پل افغانستان کے مقام پر موٹر کار کے حادثہ میں فوت ہوئے۔ بعد فوتیدگی حکومت افغانستان نے اعزاز کے ساتھ تجہیز و تکفین کر کے احمد شاہ کے قبرستان قندھار میں دفنایا۔

"Never forget them from your hearts who sacrificed for your human rights"

7 مارچ 1977ء کا کارڈ انہوں نے خوبصورت اور عظیم انسانوں کے نام کر دیا؛

''جمہوری بنیادوں پر انتخابات میں جدوجہد کرنے والوں کے نام''

نیچے انہوں نے انتخابات کی تاریخیں دی ہیں؛

''قومی اسمبلی کے انتخابات

On Monday 7th March, 1977

صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات

On Thursday 10th March, 1977"

پھر بہت اچھی نصیحت کرتے ہیں؛

"Cast Your vote without any favour or fear

to achieve your democratic rights my dear"

اپریل1977ء کا کارڈ حقیقی معنوں میں ایک جنرل سٹور ہے۔ ہر چیز آپ کو مختلف ورائٹی میں مل جائے گی۔ کارڈ ہر ایک جانب سے دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ ایک سائیڈ میں دائیں طرف یوم مئی کو منایا گیا ہے؛

"سلام پہ شما اے شکاگو شہیدان
زخونِ شما شد مشعل فروزان"

My hearty salam to all Comrades

to memory of Chicago Comrades

''یکم مئی 1886ء کو شکاگو (امریکہ) کے محنت کشوں نے متحد ہو کر اپنے حقوق کے لئے اپنے خون سے یوم مئی کے مشعل کو فروزاں کیا۔ آج دنیا کے تمام محنت کش اس روشنی میں رواں دواں ہیں۔''

بائیں طرف ان کے بیٹے جہاں وش کی تصویر ہے جس کی وہ دوسری سالگرہ 12 اپریل کو منا چکے۔ اب بچے کی زبان میں وہ لوگوں سے مخاطب ہیں۔

''جہاں وش کریم ءِ وشیں سلام پہ امن و امان
نم مبو شاد کام

A sweet Salam to all Peace Lovers

From Jahan Vash with Peace Flowers

کارڈ کی دوسری جانب وہ اپنے نام اقوام متحدہ کے مونوگرام والے خط کی کاپی چھاپتے ہیں؛

" Dear Mr. Amn.

The Secretary General has asked me to thank you for the message of congratulation which you sent him upon his appointment to another term of office as Secertary General of the United Nations. It was kind of you to convey your good whishes to the Secretary General who very much appreciated your thoughtfullness.

with best regards,
yours sincerely,
Special Assistant
to Secretary General"

اسی سال مئی میں ان کے دو اور کارڈ چھپے جن میں ایک پر بائیں جانب بابو ایک خوبصورت خوش لباس انداز میں ٹائی لگائے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ لکھا ہے؛''عبدالکریم شورش 1935ء میں''۔ دائیں طرف ایک اور نوجوان کی دُھندلی سی تصویر ہے جس کے ساتھ لکھا ہے؛''مرحوم سردار یار محمد خان کرد جنہیں خاندانی تنازعہ پر قتل کر دیا گیا۔''

ہم حیران ہوئے کہ گو کہ بابو اپنی پوری زندگی فیوڈل سے جان نہ چھڑا سکے تھے۔ اور ہر وقت سوشلزم کا نظریہ رکھنے کے باوجود فیوڈلوں کے جلو میں سیاست کرتے رہے مگر مذکورہ کرد سردار کا سیاست میں بھی ہم نے نام نہ سنا تھا تو بھلا بابو کا ان سے کیا رشتہ ہو سکتا ہے۔ بہر حال وہ اسے اپنی تحریر میں واضح کر دیتے ہیں؛

''یہ 31 مئی 1935ء کا تباہ کن زلزلہ کوئٹہ۔ مستنگ اور قلات بلوچستان کے دوسرے روز یکم جون 1935ء کا واقعہ ہے جبکہ میں اپنے ایک ہمراہی کے ساتھ زلزلہ کے اثرات سے بچ بچا کر کوئٹہ سے پیدل چل کر اور ہزار گنجی کے مقام میل 13 اور 14 پر ایک بار برداری اونٹ پر سوار مستنگ جا رہے تھے کہ 12 بجے کو میرا 1931ء کا دوست بلوچستان میں کرد قبیلہ کا نوجوان سردار یار محمد اپنے نیلے رنگ کے شیورلیٹ موٹر کار میں اپنے گھر دشت گونڈین، درہ بولان سے مستنگ جا رہے تھے جہاں ان کا چاچا رسالدار غلام حیدر خان کرد زلزلہ میں وفات پا گئے تھے۔ مجھے اونٹ پر سوار دیکھ کر

اسی جگہ موٹر کھڑی کردی جہاں آجکل ''نوکیں دور'' کا بورڈ نصب ہے اور مجھے اونٹ سے اتار کر مستنگ لے گئے۔''

مئی کے دوسرے کارڈ پر بھی دلچسپ باتیں ہیں۔اوپر کی دوسطریں ہیں؛

''نیک دعاؤں کے ساتھ پاکستان اور تیسری دنیا کی فلاح و بہبود کے محور پر حکومت پاکستان اور پاکستان قومی اتحاد کے مذاکرات ہمیشہ کیلئے کامیاب ہوں (کریم امن ہزار گنجی۔ بلوچستان۔پاکستان)''۔

لکیر کے نیچے دوالگ الگ موضوعات کوجگہ دی گئی ہے۔ایک یوں ہے؛

چنین گفت و دھقاں دانش پژده
مرایں داستاں راز پیشین گروه
که نزدیك زابل به سه روزه راه
یکے کوه بدسر کشیده بماه
به یك سوئی اودشت ذگاه بود
دگر دشت هندوستان راه بود
نشته دراں دشت بسیار کوچ
زافغان ولا چین و کردو بلوچ

ستمبر کے کارڈ کے ایک طرف سابقہ باتوں کے علاوہ نیچے یہ جملہ لکھا ہے؛

''کریم امن ہزار گنجی بلوچستان پاکستان (سابق عبدالکریم شورش)۔ایڈیٹر نوکیں دور بلوچی کوئٹہ کے ساتھ تعاون وامداد کی خاطر۔ ہدیہ پانچ روپے''

کارڈ کی دوسری جانب نیچے مرحوم ملک عبدالرحیم خواجہ خیل اور مرحوم قاضی عبدالصمد سرباز ی کی تصاویر ہیں اوراوپر تحریر ہے؛

''بلوچستان اور پاکستان کے نامی گرامی قاضی عبدالصمد سربازی صدر مجلس شوریٰ قلات جو 7دسمبر 1974ء کو وفات پاگئے،کی تیسری برسی اور ملک عبدالرحیم خواجہ خیل مستنگ بلوچستان جو 21اکتوبر 1965ءکوفوت ہوگئے ہیں کی بارہویں برسی بروز جمعہ 21اکتوبر 1977ءکومنائی جائے گی۔''

خان قلات میراحمد یارخان کی وفات اور داؤد جان کی ''تخت نشینی'' کے موقع پر بابو نے

دوکارڈ شائع کیے۔یہ کارڈ پچھلے سارے کارڈوں سے بڑے سائز کے ہیں اوران میں کوئی کیلنڈر انہوں نے شائع نہیں کیا۔علاوہ ازیں ان کارڈوں میں صرف ایک طرف تحریر ہے،دوسری طرف کچھ نہیں لکھا۔پہلا کارڈ سبز رنگ میں ہے،ایک طرف تو بابو اپنے روایتی انداز میں بیگ ہاتھ میں لئے دوسرے ہاتھ سے ہمیں ''ہیلو'' کہہ رہے ہیں جبکہ دوسری طرف' وہ اور میراحمد یارخان ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھے فوٹو اتروانے کا پوز بنائے کھڑے ہیں اورسرخ روشنائی میں لکھا ہے؛

''آہ ! بلوچستان ءِ نامداریں خان معظم الحاج میر احمد یار بلوچ 20اکتوبر 1977ءَ اسلام آباد پاکستان ءَ وفات بوت۔جمعہ ءِ روچ 21اکتوبر 1977ءَ قلات ءَ قبر کنگ بوت۔''

نیچے ایک عدد رباعی؛

کریم امن ءِ نیکیں دعا انت مروچی
په امن و امان جانشین خان ننا
نصیر نوری ءِ نام توار برزکن
بلوچستان ءِ شان ءَ شرفدار کن

دوسرے کارڈ میں پچھلے کارڈ سے دو رباعیاں فرق ڈالتی ہیں وگرنہ دونوں کارڈ ایک جیسے ہیں۔رباعیاں یوں ہیں؛

دلا بیار بلوچانی کا روکتار
اچ بابل تان دلی ءِ ملگزار
هزارانی سالا بلوچ نام توار
پرشته من دنیاءَ هر یك دیار

دوسری رباعی داؤد جان کے لئے ہے؛

کریم امن ءَ وشیں دعا گوش دار
په داؤد خان ءَ گچین هوش دار
نصیر نوری ءِ نام ءُ توار برزدار
بلوچستان ءِ شان و شرف پیش دار

نومبر 1977 ء کے کارڈ میں بابو کی تصویر ہے مزار اقبال پر،وہ وہاں فاتحہ پڑھ رہے

ہیں۔ جبکہ اوپر اقبال کے لئے اپنی خواہش ظاہر کرتے ہیں؛

کریم امن ءِ پُرسِتك وشیں سلامان
پہ اقبال ءِ صد سال دور ءِ سر شان

پھر ایک سرخی ہے؛

''صد سالہ سالگرہ 9 نومبر 1877ء سے 9 نومبر 1977ء تک مبارک ہو۔''

اس سے نیچے اقبال کی مشہور نظم ''بوڑھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو'' کے اشعار چھپے ہوئے ہیں۔ آیئے ہم بھی پڑھتے ہیں:۔

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ
اخلاق عمل مانگ نیاگانِ کُہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنواز ند گدارا

انہی برسوں میں بلوچستان میں سماجی شعور سے منور کچھ نوجوان سیاسی میدان میں نمودار ہوئے تھے۔ اپنے طریقے سے وہ یہاں ایک انقلابی سیاست کی داغ بیل ڈالنے کے طویل اور صبر آزما کام میں لگ گئے۔ انہوں نے پندرہ روزہ ''نوائے وطن کوئٹہ'' اور ہفتہ روزہ ''عوامی جمہوریت لاہور'' میں اپنے تجزیے اور رپورٹیں چھپوانا شروع کیں۔ نوائے وطن تو نچلے طبقات کا مستقل مزاج طرفدار تھا جسے ملک محمد پناہ چلاتے تھے۔ جبکہ عوامی جمہوریت اس خطے کے سب سے بڑے کمیونسٹ جناب سی آر اسلم کی جدوجہد کا عکس تھا۔ ان دونوں اخبارات نے اس دور میں نوجوانوں کو بہت متاثر کیا۔ انہیں سائنسی سماجی شعور بخشا اور فیوڈلوں، نعرے بازوں کا باندی بننے کے بجائے ایک طبقاتی اور عوامی جمہوری سیاست کا راستہ دکھایا۔ چنانچہ ''پٹ فیڈر کا سانحہ'' اسی زمانے میں دونوں اخبارات

میں یکے بعد دیگرے چھپا۔ آیئے دیکھیں کتنا خالص، کتنا سچا اور کتنا کھرا موقف ہے؛

''پٹ فیڈر کے علاقہ میں گذشتہ دنوں پیش آنے والا خونی سانحہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے بلکہ جب سے اس بے آب و گیاہ میدانی علاقے کو دریائے سندھ کے پانی سے سیراب کرنے کیلئے نہری نظامِ آبپاشی کی بنیاد پڑی ہے، صاحبِ ثروت و اقتدار لوگوں نے کئی بے گناہ انسانوں کو اپنی ہوسِ ملکیت کا نشانہ بنایا ہے۔ اور اب تک ہزاروں افراد کا خون نہر کے پانی کے ساتھ اس دھرتی میں جذب ہو چکا ہے۔ اس وقت ہزاروں ایکڑ اراضی کی ملکیت کا دعویٰ کرنے والے جو بڑے بڑے وڈیرے سرمایہ دار، سردار اور تجارت و ملازمت پیشہ افراد نظر آتے ہیں ان میں سے شاید ہی کسی کا تعلق اس سرزمین سے ہو۔

''ہم نے یہی تجویز پیش کی ہے کہ سب سے پہلے مستحق وہ لوگ ہیں جو زمانہ قدیم سے اس پر آباد رہے ہیں۔ اس کے بعد ضلع کچھی کے وہ کاشتکار حقدار بنتے ہیں جن کے پاس پہلے سے کوئی قابلِ کاشت زمین موجود نہیں ہے اور تیسرے نمبر پر بلوچستان کے وہ خانہ بدوش قبائل آتے ہیں جن کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں ہے اور وہ صدیوں سے دو چار جانوروں کو ہانکتے ہوئے شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال یا مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب کی طرف مصروفِ سفر رہتے ہیں۔ اگر اس طرح گزارہ یونٹ کے حساب سے مذکورہ بالا گروہوں میں یہ زمین تقسیم کردی جائے تو اس خوانِ یغما پر تبریک و تازیاں کرنیوالے جاگیرداروں کے قتل و غارت گری کا کوئی موقع باقی نہ رہے اور خانہ بدوشی کی دیرینہ لعنت سے غریب اور بے سہارا عوام کو ہمیشہ کیلئے نجات مل جائے۔

''سرکاری طور پر پٹ فیڈر کے حالیہ خونی واقعہ میں جاگیرداروں کے ہاتھوں قتل ہونے والے کاشتکاروں کی تعداد پانچ بتلائی گئی ہے جبکہ غیر سرکاری اندازے اسے کچھ زیادہ ظاہر کرتے ہیں۔ بہر حال پانچ انسانی جانوں کا اتلاف کوئی کم اندوہناک واقعہ نہیں۔ بعض لوگوں نے اس حادثے کی ذمہ داری مقامی انتظامیہ پر عائد کی ہے۔ بلاشبہ مقامی انتظامیہ اپنی بے حسی اور غفلت شعاری کے باعث اس خونی حادثہ کے سرزد ہونے سے بری الذمہ نہیں ہوسکتی لیکن اس خرابی کی اصل جڑ فرسودہ جاگیرداری نظام ہے۔ جس کو سہارا دینے اور مضبوط بنانے والی قوت سرکاری

انتظامیہ ہے۔ یہ اصل جڑ جاگیرداری نظام کے خاتمے ہی سے ختم ہوسکتی ہے۔تاہم گذشتہ حکومت کی زرعی اصلاحات کی وجہ سے ہزاروں کاشتکاراسی زمرے میں آتے ہیں۔ یہ لوگ زرعی اصلاحات کی رو سے اپنی مقبوضہ اراضی کے مالک قرار پاچکے ہیں۔ یہ کسی جاگیردار کے مزارع نہیں رہے اور نہ کسی جاگیردارکوان سے بٹائی وصول کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ سراسر جاگیرداروں کی زیادتی اور سینہ زوری ہی نہیں بلکہ قانون شکنی کا ایک نہایت ہی گھناؤنا جرم ہے کہ انہوں نے کاشت کاروں کے خون پسینہ سے حاصل شدہ فصل کو بزور اٹھالے جانا چاہا۔ جب کاشتکاروں نے مزاحمت کی جس کا انہیں پورا حق حاصل تھا تو جاگیرداروں نے اپنے پالتو کرائے کے غنڈوں کے ذریعے پوری بستی کا گھیراؤ کر کے ان پر گولیوں کی بارش کردی جس کے نتیجے میں پانچ مظلوم کاشت کار اپنے حق کی مدافعت کرتے ہوئے ہلاک ہوگئے۔۔۔۔‘‘

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان دونوں اخباروں نے نعرے بازی سے ہٹ کر مسائل کو دیکھا۔ اس زمانے میں ’’مسئلہِ بلوچستان‘‘ سیاسی اور صحافتی عنوان بن چکا تھا۔جس کی آڑ میں بیوروکریسی اپنے بنگلوں کی تعداد بڑھایا کرتی تھی اور چندہ اکٹھا کرنے والے جیبیں بھرا کرتے تھے۔ ایک حقیقی اور سنجیدہ مسئلے کو کم اہم بنانا ہوتو اسے بازاری دانشوروں کے ہاتھ میں دے دو۔ وہ سرکار کی (درپردہ) فرمائش کے عین مطابق دوچار موٹے موٹے ،نعرے باز قسم کے مضمون لکھ ماریں گے اور اس کے بعد بڑے ’’فنڈ باز‘‘ انداز میں اپنی جیب کی سلامتی کو یقینی بناتے رہیں گے۔ستر کی دہائی ہو یا آج اکیسویں صدی کا اوائل ،ایسے لوگوں میں کمی نہیں آئی۔ بنیاد چھیڑے بغیر مسئلہ کو بالوں سے پکڑ کر اُس سے کھیلنا اُن کا وطیرہ ہے۔مگر بلوچ کے اس حقیقی مسئلہ کو اس کے اصلی سیاق وسباق کے ساتھ بابو کے پیروکار، انہی دانشوروں اور انہی اخبارات نے پیش کیا۔شان گل بلوچ نے ہفت روزہ ’’عوامی جمہوریت‘‘ میں ’’مسئلہ بلوچستان کا سیاسی و معاشی پس منظر‘‘ نامی ایک طویل مضمون میں اس مسئلہ پر لکھا۔

بابو عبدالکریم امن کا دس فروری 1979ء کا کارڈ،تاریخ کے ایک عجب دوراہے کی نشاندہی کرتا ہے۔ جہاں بائیں طرف اوپر ذوالفقار علی بھٹو کی تصویر ہے، نیچے بابو کھڑے ہاتھ

ہلا رہے ہیں اور دائیں طرف افغانستان کے صدر نور محمد ترہ کی اور سوویت یونین کے صدر لیونڈ برژنیف کی تصویر دی ہوئی ہے جن کے اوپر بڑی تحریر کی سرخی یوں ہے؛

’’عالمی سیاست میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کے کردار کے لئے سوویت روس اُن کا ممنون ہے۔پاکستان کے عوامی راہنماؤں اور عالمی سربراہوں کی جانب سے جاں بخشی اور رہائی کی اپیلیں۔‘‘

کارڈ کا متن یوں ہے؛’’ پاکستان کے عوامی رہنماؤں اور دنیا کے اکثر ممالک کے سربراہوں نے پی پی پی اور اسلامی سربراہ کانفرنس کے چیئرمین اور پاکستان کے سابق صدر اور وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت کو ختم کرنے اوران کی رہائی کے لئے پاکستان کے صدر جنرل ضیاالحق سے اپیل کی ہے۔ان ممالک میں سوویت روس کے صدر لیونڈ بریژنیف نے کہا ہے کہ اگرچہ جناب بھٹو کی سزائے موت کا معاملہ پاکستان کا داخلی معاملہ ہے لیکن عالمی سیاست میں جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جو کردار ادا کیا ہے۔اس پر سوویت یونین ان کا ممنون ہے۔ان ممالک میں افغانستان کے صدر نور محمد ترہ کی ، بھارت کے صدر سنجوا ریڈی، وزیراعظم ڈیسائی، سابق وزیراعظم اندرا گاندھی وزیر خارجہ اٹل بہاری، جنتا پارٹی کے صدر چندر شیکھر، جے پرکاش نرائن ،ترک وزیراعظم بلند ایجوت، برطانوی وزیراعظم کالاہان، اقوام متحدہ کے جنرل سیکرٹری والڈ ہائیم، امریکی صدر جمی کارٹر، مصری صدر انور السادات، مراکش کے صدر شاہ حسن، اردن کے شاہ حسین، متحدہ عرب امارات کے صدر شیخ بن زید، عراقی وزیر خارجہ سعدی حمادی، چینی صدر ھوا کوفنگ ، آسٹریلوی وزیر خارجہ انڈریو پیکاک، شام کے صدر حافظ اسد، ناروے کے وزیراعظم، تیونس کے صدر بورقیبہ، سویڈن کے وزیراعظم ،سپین کے شاہ کارلوس، سینگال اور کینیا کے صدر ، بحرین اور دبئ کے امیر، پوپ جان پال اول، پاکستان کے سابق صدر فضل الٰہی چوہدری اور دوسرے عوامی راہنما شامل ہیں۔کریم امن ہزار گنجی بلوچستان نے بھی مخلصانہ اپیل کی ہے کہ پاکستان کی فلاح و بہبود اور عالم اسلام کے لئے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی اہم خدمات کا تقاضا ہے کہ انکی سزائے موت کو ختم کر کے رہا کیا جائے۔اور پاکستان کے اتحاد اور بہبود کو قائم رکھا جائے۔‘‘

9فروری 1979ء کا پندرہ روز نوائے وطن بھی ذوالفقار علی بھٹو کو چھ فروری کے سپریم

کورٹ کے جانب سے سزائے موت دینے کے بارے میں وقف ہے۔ اور ظاہر ہے ملک محمد پناہ اپنے پرچے کی اشاعت برقرار رکھنے کے لئے بہت ہی بالواسطہ طور پر بھٹو کی جاں بخشی کے حق میں لکھتے ہیں۔ ساتھ ہی مولویوں کی سیاست پر بھی اپنی نپی تلی محتاط اور ماہرانہ انداز میں چوٹ کرتے جاتے ہیں۔ وہ اپنے اس پورے رسالے میں بھٹو پھانسی کیس ہی کا ذکر کرتے ہیں اور آخری پیراگراف میں ان کا کہنا ہے...... ''ہمارے نزدیک مسٹر بھٹو کی ذات کی کوئی اہمیت نہیں۔ بطور فرد ہر پاکستانی کی حیثیت برابر ہے۔ لیکن بھٹو نے اپنی جاگیردارانہ انا کے تحت جہاں بہت سے آمرانہ اقدامات کئے اور ذاتی ناپسندیدگی کے باعث بہت سے لوگوں کو اذیتیں دیں خصوصاً بلوچستان کے عوام کو درندگی کی حد تک مظالم کا نشانہ بنایا۔ لیکن اس کے ساتھ پاکستان کی تاریخ میں یہ کارنامہ بھی اسی آمر اور ظالم بھٹو کے ہاتھوں سرانجام ہوا کہ اس نے نچلی سطح کے عوام کو بھرپور خود اعتمادی اور حق شناسی کا شعور بھی دیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بھٹو کے حق میں نہ تو ملک کے اندر کوئی آواز بلند ہوتی اور نہ ہی باہر سے...... چنانچہ ان ہی اہم نکات کی بنا پر ہم بھٹو کی جاں بخشی کے لئے اٹھتی ہوئی آوازوں کی حمایت کرتے ہیں۔''

اسی دوران افغانستان میں زرعی اصلاحات کے تحت 44 ہزار بے زمین بلوچ' زمین کے مالک بنا دیا دیے گئے۔ بابو کے پاس اخبار نہ تھا تو کیا ہوا، اُن کی جگہ اُن کا موقف پیش کرنے کے تو اور ذرائع وجود میں آ چکے تھے۔ 7 فروری 1979ء کے ہفت روزہ ''سوب'' کابل' میں اس کا ذکر ان خوبصورت الفاظ میں کیا گیا ہے؛

''نیمروز ایک زمانے میں بڑے شہری مراکز کا علاقہ ہوا کرتا تھا۔ اور یہ مدنیت عہدِ وسطیٰ سے قائم تھی۔ اس کی ساری آبادی زراعت سے وابستہ رہی ہے۔ یہ علاقہ فیوڈلوں نے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ نیمروز میں ایک ملین جریب زرعی زمین 40 ہزار خاندانوں کے ہاتھ لگ گئی۔ ایسے ایسے جاگیردار بھی تھے جن کے پاس اکیاون ہزار جریب زمین تھی اور ہزاروں بزگر اُن کی خدمت کیا کرتے تھے۔ پھر بھی ان جاگیرداروں سے اس زمین کی کاشت مکمل نہ ہو سکتی تھی اور ہر سال ہزاروں جریب کاشت سے رہ جاتے تھے۔

''علاقہ کے کسان اپنے بال بچوں کی کفالت کے لئے بیرونی ممالک جا کر محنت مزدوری پر مجبور تھے۔ چونکہ سرداری نظام کی مشینری پرانی ہو چکی ہے۔ یہ سردار لوگ بہت مقروض ہوتے گئے۔ پھر کسانوں کے بیرون ملک جانے سے بھی ان کی زرعی پیداوار کم ہوتی گئی۔

''افغان انقلاب کی حکومت نے زمین کی جمہوری اصلاحات کیں اور بے زمین کسانوں میں زمین مفت بانٹ دی۔ اسی آٹھویں فرمان کے ذریعے نیمروز کے 44 ہزار خاندان زمین کے مالک بن گئے۔''

''سوب'' کے اگلے شمارے میں بھی انہی زرعی اصلاحات سے متعلق مضامین موجود ہیں۔ ایک شمارے میں نور احمد ارمان کا ان زرعی اصلاحات پر یہ کلام چھپا ہے؛

جار

اے دنیا اگہ چپی بیت
یا آسمان گون مانکی بیت
یاڈ گار بروث بہ آسمانا
مئے سراستر سکیّ بیت
فیوڈلزم بایدنت گار بیت
مچ ڈگار بایدنت بھر بیت
مات وطن مئے استمانءِ
مگہ جاہ ات سیٹھ و خانءِ
خانء بیك حونوریں گرك انت
بزگیں لوچء بے نانءِ
هشمتی فرمان مئے یار بیت
مچ ڈگار باید انت بھر بیت
اے ملاك و فیوڈ الان
اے مفت خوربری بے کاران
نون شمئے ڈگارداتہ بوت
بہ بزگر و بہ پھوالان
کہ هشکیں وطن بھار بیت
مچ ڈگار بایدانت بھر بیت

انہی تاریخوں میں بابو کا ایک دوسرا کارڈ بھی چھپ گیا جس میں ایک طرف حسبِ معمول کیلنڈر ہے۔ اور دوسری طرف عطا اللہ مینگل، میر غوث بخش بزنجو، خان محمد ہاشم خان غلزئی اور سردار خیر بخش مری کی تصاویر ہیں۔ بابو خود ہاتھ لہراتے کھڑے ہیں اور یہ خبر چھپی ہے؛

''بلوچستان کے ہمہ جہت عوامی اور جمہوری
فلاحی مفادات کے پیش نظر مثبت فیصلہ کریں گے

''کریم امن ہزار گنجی نے نیک تمناؤں کے ساتھ دعا کرتے ہوئے کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کے کارکنوں سے اپیل کی ہے کہ بلوچستان میں امن اور فلاح کے مفادات کے پیش نظر 15 فروری 1979ء کے مجوزہ اجلاس مینگل ہاؤس بروری روڈ کوئٹہ میں شامل ہو کر بلوچستان کے ہمہ جہت عوامی جمہوری فلاحی مفادات کے محور پر مثبت فیصلہ کریں۔''

پتہ نہیں سرقبیلوی نظام ہمیں آگے بڑھنے کیوں نہیں دیتا۔ بابو ایک طرف اس نظام کے خلاف لڑتے ہیں، سوویت یونین کا دفاع کرتے ہیں، ترہ کی صاحب کے افغانستان سے اپنائیت قائم کرتے ہیں.......... مگر پھر واپس مینگل ہاؤس جا کر لینڈ کر جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ اُن سے پہلے بھی جاری رہا، اور ان کے بعد اب تک انہی ہاؤسوں میں انقلاب ٹوٹتے رہنے کا تسلسل قائم ہے۔ اللہ بصارت عطا فرمائے۔

جون 1979ء کا جاری کردہ کارڈ؛

''کریم امن ہزار گنجی نے نیک تمناؤں کے ساتھ حکومت پاکستان اور خصوصاً جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی، PNA اور ان کی ذیلی تنظیموں اور ایران کے آیت اللہ خمینی کی حکومت اور انتظامیہ سے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ اسلام کے نام پر افغانستان کے کامیاب عوامی انقلاب کے خلاف معاندانہ اور مخالفانہ پروپیگنڈہ اور اندرونی مداخلت کو بند کر دیں۔ تاکہ پاکستان اور ایران کے افغانستان کے ساتھ دوستانہ اور بھائی چارہ کے تعلقات زیادہ کشیدہ نہ ہوں۔ اور وہ لوگ نور محمد ترہ کی کی فعال اور صالح عوامی انقلاب کی افغانستان کے محنت کشوں اور کسانوں کی فلاح و بہبود میں اصلاحات کے اقدامات کو غیر اسلامی کہنا بند کریں۔''

اسی طرح کی وابستگی رکھتے تھے ہمارے بزرگ افغان انقلاب کے ساتھ۔ وہ لوگ اس عوامی انقلاب کی ہر خوشی، ہر غم میں ساتھ رہتے تھے، اٹھتے بیٹھتے لکھتے پڑھتے۔۔۔۔ دیکھئے اکتوبر 1979ء کا کارڈ کیا کہتا ہے؛

''کریم امن ہزار گنجی بلوچستان نے جناب کامریڈ نور محمد ترہ کی کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے اور مرحوم کامریڈ نور محمد ترہ کی کے اہل خاندان' خلق پارٹی کے اراکین اور انقلاب ثور کے دوستوں اور حامیوں سے اظہار تعزیت کرتے ہوئے دعا کی ہے کہ خلق پارٹی کے اراکین مرحوم کے نقش قدم پر چل کر انقلاب ثور کی کامرانی اور کامیابی کیلئے اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔''

اگلا کارڈ 1979ء کا کیلنڈر لیے ہوئے ہے جس کی پشت پر بزنجو' مینگل' مری اور بگٹی کی تصاویر ہیں اور بابو کا لہراتا ہوا ہاتھ ہے۔ تحریر ہے؛

''پاکستان اور بلوچستان کے فلاحی مفادات میں بلوچستان کے راہنماؤں سے مخلصانہ اپیل:

''سطحی اور انفرادی اختلافات کو بھلا کر فلاحی مفادات اور تعمیر و ترقی میں متحد ہو جایئے۔

''کریم امن ہزار گنجی نے نیک تمناؤں کے ساتھ بلوچستان کے رہنماؤں میر غوث بخش بزنجو، سردار خیر بخش خان مری، سردار عطا اللہ مینگل، سردار محمد اکبر خان بگٹی اور ان کے ساتھیوں اور حامیوں سے مخلصانہ اپیل کی ہے کہ وہ اپنے سطحی اور انفرادی اختلافات کو بھلا دیں۔ پاکستان اور بلوچستان کے نظریاتی فلاحی مفادات اور تعمیر و ترقی میں متحد ہو کر جدوجہد کریں۔ جب تک ہم متحد نہیں ہوں گے تب تک ہم پاکستان اور بلوچستان کے فلاحی مفادات اور تعمیر و ترقی کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔''

مارچ، اپریل 1979ء کے کارڈ میں کیلنڈر کی پشت پر بابو نے مولانا شمس الدین کی تصویر لگا کر ان کی پانچویں برسی کی تقریبات کی خبریں دی ہے؛

''جمعیت علمائے اسلام بلوچستان کے صدر اور بلوچستان اسمبلی کے ڈپٹی سپیکر مولانا شمس الدین جنہیں بروز بدھ 13 مارچ 1974ء بوقت تین بجے بعد دوپہر بمقام خلگئی قلعہ سیف اللہ جبکہ

وہ اپنی موٹر میں اکیلے فورٹ سنڈیمن (ژوب) جا رہے تھے، نامعلوم اشخاص نے پستول کی گولی سے مار کر شہید کر دیا تھا۔ ان کی پانچویں برسی اپوزئی ژوب، کوئٹہ اور بلوچستان کے دوسرے شہروں میں عقیدت کے ساتھ منائی گئی۔ ژوب میں شہید کے والد مولانا محمد زاہد نے شہید کی پاکستان اور بلوچستان کے مفادات میں جدوجہد اور خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔ کوئٹہ اور بلوچستان کے دوسرے شہروں میں مقررین نے اپنی تقاریر میں مطالبہ کیا کہ آج تک نہ تو شہید کے قاتلوں کا پتہ چلا کر انہیں گرفتار کیا گیا ہے اور نہ ہی انہیں انصاف اور قانون کے مطابق قرار واقعی سزا دی گئی ہے۔

’’کریم امن ہزار گنجی نے پرزور مطالبہ کیا ہے کہ شہید شمس الدین کے قاتلوں کا پتہ لگا کر انہیں گرفتار کیا جائے اور انصاف اور قانون کے مطابق سزا دی جائے۔‘‘

اگلا کارڈ بھی مارچ کے اواخر اور اپریل کے شروعات کا ہے جس میں انہوں نے سردار عطا اللہ مینگل اور میر گل خان نصیر کی این ڈی پی میں شمولیت کی خبر شائع کی ہے؛

’’14 مارچ 1979ء کو کراچی میں نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی کے صدر سردار شیر باز خان مزاری کی رہائش گاہ ڈیفنس سوسائٹی میں کالعدم نیپ بلوچستان کے سابق وزیراعلیٰ سردار عطا اللہ مینگل نے اپنے ساتھیوں سمیت این ڈی پی میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر این ڈی پی کے صدر سردار شیر باز خان مزاری، بلوچستان کے سابق گورنر میر غوث بخش بزنجو، سرحد کے سابق گورنر ارباب سکندر خلیل اور سرحد کے سابق وزیر خان افضل خان بھی موجود تھے۔ شمولیت سے پہلے انہوں نے اعلان کیا کہ ہم خلوص کے ساتھ پاکستان اور اس کے چاروں صوبوں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کی سیکولرزم بنیاد پر قومیتوں اور ثقافتی اقتدار پر یکساں جمہوری اور اقتصادی بقا اور ترقی چاہتے ہیں۔

’’18 مارچ 1979ء کو بلوچستان کے سابق وزیر اطلاعات میر گل خان نصیر نے بھی اپنے ساتھیوں سمیت این ڈی پی میں شمولیت کا اعلان کیا۔ کریم امن ہزار گنجی بلوچستان نے نیک تمناؤں کے ساتھ آپ کی شمولیت پر مبارکباد دیتے ہوئے دعا کی ہے کہ بلوچستان میں این ڈی پی ان کی فعال قیادت میں پاکستان اور بلوچستان کے فلاحی اور جمہوری مفادات میں زیادہ سے زیادہ کامران

و کامیاب ہو جائے۔‘‘

پتہ نہیں صحافت کی یہ صورت بلوچ سے باہر بھی کہیں موجود رہی ہے یا یہ صرف اور صرف بلوچ صفت ہے۔ تنگدستی کے باوجود، یہ تو خبریں ہیں۔ خبریں جنہیں ہاکر بانٹتا پھرتا تھا۔ تاریخ میں اگر افلاطون کا ذکر تو موجود ہو، ٹام پین کا ذکر ہوتا ہو مگر بابو شامل نہ ہوں تو یہ ناانصافی تو ہوئی نا! یہ سُستی کس کی ہوئی۔ ہماری۔۔۔۔۔ ہم بلوچوں کی، ہم بلوچ دانشوروں اور رائٹرز کی!!

مارچ 1979ء کے اواخر میں اپنے ایک کارڈ میں بابو نے سردار میر بہادر خان بنگلزئی کی تصویر کے ساتھ یہ تحریر چھاپی؛

’’پاکستان اور بلوچستان کے فلاحی اور جمہوری مفادات میں عدلیہ کا آزادانہ وقار ہمیشہ کیلئے قائم و دائم ہے۔

’’عدالت عالیہ بلوچستان کے حکم پر پیپلز پارٹی بلوچستان کے راہنما سردار بہادر خان بنگلزئی کو رہا کر دیا گیا۔

’’15 مارچ 1979ء کو ہائی کورٹ بلوچستان کے بنچ جو چیف جسٹس جناب میر خدا بخش مری اور جسٹس جناب میر ہزار خان کھوسہ پر مشتمل تھا، نے پی پی پی بلوچستان کے رہنما سردار میر بہادر خان بنگلزئی کو 5 ہزار روپے کی ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیدیا ہے۔ سردار بہادر خان کو مارشل لاقوانین کے تحت نااہلی کے ایک ٹریبونل نے ایک سال قید سخت اور دو لاکھ روپے جرمانے کی سزا دی تھی۔ عدالت عالیہ میں سردار بہادر خان کی جانب سے جناب عزیز اللہ میمن ایڈووکیٹ اور سرکار کی جانب سے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جناب محمد یوسف نے پیروی کی۔

’’کریم امن ہزار گنجی بلوچستان نے نیک تمناؤں کے ساتھ اظہار کرتے ہوئے دعا کی کہ پاکستان، بلوچستان کے فلاحی اور جمہوری مفادات میں عدلیہ کا آزادانہ وقار ہمیشہ کیلئے قائم و دائم رہے۔‘‘

اپریل 1979ء کے اواخر کے کارڈ میں بابو نے بھٹو صاحب کی پھانسی کی رپورٹ اپنے اس شعر سے شروع کی۔

نمیران بیئے ذوالفقار علی بھٹو
پہ ملک و عواما شہید ہوتگئے

’’4 اپریل 1979ء کو نواب احمد خان قصوری لاہوری کے مبینہ اور مشتبہ قتل 11 نومبر 1974ء کے الزام میں پی پی پی اور اسلامی سربراہ کانفرنس کے چیئر مین اور تیسری دنیا کے رہنما پاکستان کے سابق صدر اور وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو‘ چیف مارشل لاایڈ منسٹریٹر اور صدر پاکستان جنرل ضیاالحق کے حکم پر رات کے دو بجے ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں پھانسی دے کر شہید کردیے گئے۔اس کے بعد ان کے جسد خاکی کو ان کی وصیت کے مطابق ایک طیارے میں فوج کی نگرانی میں ان کے آبائی گاؤں نوڈیرو تحصیل لاڑکانہ لے جا کر قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔

3 اپریل 1979ء کو محترمہ بیگم نصرت بھٹو اور ان کی صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو کو سہالہ پولیس کیمپ جہاں وہ نظر بند ہیں، ڈسٹرکٹ جیل لاکر آخری ملاقات کرادی گئی۔رات کی تاریکی میں پھانسی دینے کے خلاف پاکستان اور ساری دنیا میں رنج والم اور غم وغصے کا اظہار کیا جارہا ہے جبکہ پاکستانی عوام اور ساری دنیا کے سربراہان مملکت نے جنرل ضیا سے جان بخشی کی اپیلیں بھی کردی تھیں۔

’’کریم امن ہزار گنجی بلوچستان نے شہیدِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو کی روح جاوداں کے لئے دعا کی ہے کہ شہیدِ اعظم کے عوامی اور جمہوری مشن کی کامیابی کیلئے جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔‘‘

اگلا کارڈ بھٹو کے چہلم کی خبر کے بطور چھاپا گیا۔اور اپنی طرف سے ان کے اہل خانہ کے ساتھ تعزیت کا اظہار کیا گیا ہے۔

اپریل 1979ء ہی کے ایک کارڈ پر بابو نے عبدالصادق کاسی کی ساتویں برسی منائے جانے کی اطلاع دی ہے؛

’’بلوچستان کے جمہوری اور عوامی رہنما ملک عبدالصادق کاسی جنہیں 20 اپریل 1972ء کو بوقت 8 بجے شام کو جبکہ وہ اپنے ساتھی خان عبداللہ خان کے ساتھ رکشہ میں اپنے گھر کاسی قلعہ کوئٹہ جارہے تھے میکموھن پارک کے مقام پر نامعلوم افراد نے پستولوں سے حملہ کر کے شہید کردیا اور ان کے ساتھ عبداللہ خان کو زخمی کردیا............پشتون سٹوڈنٹس فیڈریشن بلوچستان کے اہتمام میں صادق شہید کی ساتویں برسی جمعہ 20 اپریل 1979ء کو صادق شہید پارک میں منائی جائے

گی............کریم امن ہزار گنجی بلوچستان نے اہلیان بلوچستان سے اپیل کی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں جلسہ میں شمولیت کر کے صادق شہید اور بلوچستان کے دوسرے شہدا کو بلوچستان کے حقوق اور قربانیوں کو خراج عقیدت پیش کریں۔‘‘

اگلے کارڈ میں آغا عبدالکریم بلوچ قلات اور افغانستان کے صدر نور محمد ترہ کی کی تصاویر کے ساتھ پاک افغان فرینڈ شپ سوسائٹی کے قیام کا اعلان کیا گیا؛

’’27 اپریل 1979ء کو کوئٹہ میں پاک افغان فرینڈ شپ سوسائٹی بلوچستان کے اجلاس میں درج ذیل عہدیداروں کا انتخاب کیا گیا۔عبدالکریم (آغا) بلوچ قلات بلوچستان صدر، سید امتیاز حسین حنفی سینئر نائب صدر، عبدالمجید جونیئر نائب صدر، جناب عبدالعلی کاکڑ جنرل سیکرٹری‘ ملک محمد عثمان کاسی سیکرٹری، مسٹر امان اللہ بازئی جائنٹ سیکرٹری، صاحب جان کاکڑ رابطہ سیکرٹری، محمد رفیق خزانچی۔مجلس عاملہ زمرد حسین، میرا خان مندوخیل، بی ایس او کے صدر رازق بگٹی، کامریڈ مولا داد، علی نواز بلوچ، سخی سلطان، سید محی الدین قادری، راجہ فیاض‘ راجہ رب نواز ایڈووکیٹ، حاجی شیر جان، حاجی محمد ایوب کاکڑ، امان اللہ کاسی، نادر شاہ بخاری، بی ایس او اور پی ایس ایف کے دو دو نمائندے شامل ہوں گے۔کریم امن ہزار گنجی بلوچستان نے نیک تمناؤں کے ساتھ سوسائٹی کی جدوجہد کو پاکستان اور افغانستان کی انقلابی حکومت کے درمیان زیادہ سے زیادہ دوستی‘ تعاون اور امداد کیلئے دعا کی ہے۔‘‘

اب بتایئے جنہیں ہم محض کارڈ سمجھ رہے تھے وہ تو نظریاتی صحیفے تھے‘ اخباری تراشے تھے۔صحافت کی ایک نئی مثال تھے۔

مئی کے آخر کے کارڈ میں پاک افغان فرینڈ شپ سوسائٹی کے صدر کی پریس کانفرنس کی رپورٹ دی گئی ہے؛

’’22 مئی 1979ء کو کوئٹہ میں پاک افغان فرینڈ شپ سوسائٹی کے صدر شہزادہ عبدالکریم بلوچ قلات بلوچستان نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان اور بالخصوص بلوچستان کے عوام صدہا سال سے افغانستان کے عوام کے درمیان تاریخی، ثقافتی، مذہبی اور

تجارتی رشتہ چلا آ رہا ہے۔ جب سے افغانستان میں عوامی انقلاب آیا ہے تب سے انقلاب کے بعد اس کامیاب عوامی انقلاب کے خلاف سیکڑوں خودساختہ پناہ گزینوں نے پاکستان کی سرحدی سرزمین کو افغانستان کے خلاف اڈہ بنا کر طرح طرح کا پراپیگنڈہ شروع کر دیا ہے جو پاکستان اور افغانستان کے درمیان خوشگوار تعلقات اور عوامی مفادات میں دن بدن کشیدگی کا باعث بن رہا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اس سوسائٹی کو قائم کیا گیا ہے تاکہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان دوستی اور بھائی چارے کی خوشگوار فضا کو قائم رکھا جائے۔ اور اس خطے کو پرامن ماحول میں استوار کیا جائے۔ اب جبکہ افغانستان کی انقلابی حکومت نے تمام خودساختہ فراری پناہ گزینوں کے لئے 28 مئی 1979ء تک عام معافی کا اعلان کیا ہے' ان پناہ گزینوں کا پاکستان کے سرحدی علاقوں میں رہ کر مخالفانہ پروپیگنڈہ کو بند کر کے واپس چلا جانا چاہئے اور پاکستان کے عوام کیلئے معاشی مسائل پیدا نہ کریں۔ اسی میں دونوں ممالک کی خیر ہے۔ آپ نے پاکستان کے اخبارات سے اپیل کی ہے کہ وہ مبالغہ آرا خبروں کی اشاعت سے بھی احتراز کریں تاکہ دوستانہ تعلقات میں زیادہ کشیدگی پیدا نہ ہو۔

''کریم امن ہزار گنجی بلوچستان نے نیک تمناؤں کے ساتھ دعا کی ہے کہ پاکستان اور افغانستان کے درمیان امن و امان کے ساتھ دوستانہ اور باہمی خوشگوار تعاون و امداد کے تعلقات زیادہ سے زیادہ کامران و کامیاب ہو جائیں۔''

5 جون 1979ء کی تاریخ پر جاری کردہ بلٹن ' کارڈ نہیں ہے بلکہ محض ایک کاغذ پر ہے۔ لگتا ہے اب بابو میں کارڈ چھپوانے کی بھی مالی سکت نہ رہی تھی۔ لہٰذا اب وہ کارڈ سائز کے ایک کاغذ پہ صحافت کرنے لگے۔ اس میں آپ صرف یہ نوٹ کر لیں کہ محدود جگہ پر طویل خبر کس طرح لکھ دی گئی۔ عملاً الفاظ کو ایک دوسرے کے ساتھ ٹھونس دیا گیا ہے۔ اس میں پاکستان نیشنل پارٹی کے قیام کے اعلان کی خبر ہے۔ اور وہ خبر یوں ہے؛

''کراچی یکم اور 2 جون 1979ء کو سابق نیپ کے رہنما اور بلوچستان کے رہنما اور بلوچستان کے سابق گورنر میر غوث بخش بزنجو اور سردار عطاء اللہ مینگل کی جانب سے بلائے گئے کنونشن جس میں پاکستان کے چاروں صوبوں کے گیارہ سو مندوبین نے شمولیت کی تھی، نے اتفاق رائے

سے پاکستان نیشنل پارٹی کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے بلوچستان کے میر غوث بخش بزنجو کو صدر اور پنجاب ملتان کے سید قسور گردیزی کو جنرل سیکرٹری منتخب کرا کے پارٹی کے منشور کا اعلان بھی کر دیا ہے کہ پارٹی پاکستان میں قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنائے گی۔ بلکہ جمہوریت اور عوامی فلاح و بہبود میں سماجی اور اقتصادی قوانین بنائے گی۔ پاکستان کیلئے ایک آزاد خارجہ پالیسی وضع کرے گی' قومیتوں کی جغرافیائی بنیاد پر چاروں صوبوں میں مساویانہ اساس پر جمہوریت پسند دوستوں ترقی پسند، محنت کشوں، مزدوروں اور کسانوں کے مفادات کے لئے سماجی انصاف اور عدل پر مبنی معاشرے کے قیام کے لئے جدوجہد کرے گی۔ پارٹی کا سہ رنگا پرچم لال سفید اور سبز کے درمیان ایک سفید تارا ہوگا۔ پارٹی کا منشور اور آئین ڈاکٹر شیر افضل سرحد، میر محمود عزیز کرد بلوچستان' سید قسور گردیزی پنجاب اور میر عبدالحمید جتوئی بلوچ سندھ نے تیار کیا ہے۔ پارٹی پاکستان کے چاروں صوبوں کو نوکر شاہی کے نوآبادیاتی استحصال سے بچا کر وفاقی حکومت پاکستان کے پاس صرف دفاع، امور خارجہ، کرنسی اور مواصلات باقی صوبوں کی مکمل خودمختاری کے لئے جدوجہد کرے گی۔ عام انتخابات غیر فرقہ وارانہ، مخلوط' ایک آدمی ایک ووٹ پر آزاد اور عدلیہ کی نگرانی میں کرائے جائیں گے۔ ہر قسم کی اجارہ داری اور خاص کر غیر ملکی اجارہ داری کی مخالفت کی جائیگی۔ ملک میں ایک عوامی جمہوری انقلاب کے ذریعے سماجی اور اقتصادی تبدیلی لانے کیلئے جاگیرداری اور سرمایہ داری کے تمام استحصالی ذرائع کو ختم کرے گی۔ معدنیات اور صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیا جائیگا۔ بیروزگار اور انکے کنبوں کو روزگار دلایا جائے گا۔ زرعی اصلاحات میں 25 ایکڑ نہری اور 50 ایکڑ بارانی اراضی کسانوں میں تقسیم کی جائے گی۔ پارٹی اور عوامی حامل جماعتوں کے ساتھ مختصر اور طویل المیعاد اتحاد بھی کرے گی۔

''کریم امن ہزار گنجی بلوچستان نے نیک تمناؤں کے ساتھ پارٹی کی کامرانی اور کامیابی کیلئے دعا کی ہے۔''

20 جون 1979ء کو جاری کردہ بلٹن میں؛'' کریم امن ہزار گنجی نے نیک تمناؤں کے ساتھ حکومت پاکستان اور خصوصاً جمعیت علمائے اسلام، جماعت اسلامی، پی این اے اور ان کی ذیلی تنظیموں اور ایران کے آیت اللہ خمینی اور آیت اللہ شریعت مداری کی حکومت اور انتظامیہ سے پُرزور

مطالبہ کیا ہے کہ اسلام کے نام پر افغانستان کے کامیاب عوامی انقلاب کے خلاف معاندانہ اور مخالفانہ غلط پراپیگنڈہ اور اندرونی مداخلت کو بند کردیں اور مخالفانہ ذرائع ابلاغ پر پابندی لگادیں تاکہ پاکستان اور ایران کے ساتھ افغانستان کے دوستانہ اور بھائی چارہ کے تعلقات زیادہ کشیدہ نہ ہوں اور نورمحمد ترہ کی اور حفیظ اللہ امین کے فعال اور صالح عوامی انقلاب کی افغانستان کے محنت کشوں اور کسانوں کی فلاح و بہبود میں اصلاحات کے اقدامات کو غیر اسلامی کہنا بند کردیں اور اسلام کے نام پر افغانستان کے مفرور ملاؤں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور سرداروں کے خود ساختہ مہاجرین کو واپس بھیج دیں اور سرحدی علاقوں سے انہیں دور رکھا جائے اور افغانستان کے عوام کی فلاح و بہبود کے پیشِ نظر تمام ترقی پسند اداروں کو افغانستان کے اس کامیاب انقلاب کی حمایت اور اس کی کامیابی کیلئے جدوجہد کرنا چاہئے ۔ کیونکہ یہ انقلاب بلاتمیز مذہب وملت تمام محنت کشوں مزدوروں اور کسانوں کی فلاح و بہبود میں قائم کیا گیا ہے۔ یہ انقلاب اسلامی شعائر کے خلاف نہیں ہے۔ بلکہ اسلام کے شعائر کے مطابق مساوات پر مبنی ہے۔صدر نورمحمد ترہ کی کی حکومت اور انتظامیہ نے اسلام کا نعرہ لگانے والوں کو دعوت دی ہے کہ وہ افغانستان میں آ کر بچشمِ خود مشاہدہ کریں کہ عوامی انقلاب کے نتیجے میں اسلامی اصولوں کے مطابق عوام کی فلاح و بہبود میں استحصالی ذرائع کو ختم کر کے تمام محنت کشوں، مزدوروں اور کسانوں کے لئے مساویانہ بنیاد پر ایک ترقی پسند اور تعمیر نواز صالح معاشرہ قائم کیا جارہا ہے جو اسلام کے مساویانہ اصول کے عین مطابق ہے۔''

انسان حیران رہ جاتا ہے کہ یہ بے بس و بے پیسہ بوڑھا شخص کس مٹی سے بنا تھا۔اس قدر صاف اور واضح سوچ!!۔ارے یہ کارڈ نہیں یہ تو پمفلٹ ہے۔افغان انقلاب کی موجوں میں بے شمار لوگ مشہور ہوئے۔ بھلا ایسا ہوسکتا ہے کہ عوامی انقلاب کسی بابو عبدالکریم کو گمنامی میں پڑا رہنے دے؟! فخر ہوتا ہے ایسے لوگوں کے تذکرے کیلئے ایک دو سطریں لکھ کر۔ بابو کا ذکر کرنا گناہوں کی بخشش ہے، سستیوں کا مداوا ہے۔ ہمیں پٹ فیڈر کے سارے جاگیروں کے بجائے اِس ایک انمول درویش پر فخر ہے۔

21 اور 22 جون 1979ء کو کوئٹہ میں پیپلز پارٹی بلوچستان کی صوبائی کمیٹی کے اجلاس کی ایک قرارداد کو رپورٹ کرتے ہوئے بابو نے کاغذی بلٹن میں لکھا کہ؛

''افغانستان کے عوامی انقلاب کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے پاکستان کی رجعت پسند (پی این اے) جماعتوں خصوصاً جماعت اسلامی اور جمعیت العلمائے اسلام اور ان کی ذیلی جماعتوں اور اخبارات کی جانب سے شرانگیز مخالفانہ پروپیگنڈہ کی مذمت کرتے ہوئے اسے افغانستان کے اندرونی معاملات میں صریحاً مداخلت قرار دیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ اس پراپیگنڈہ کو بند کیا جائے ۔ اور خود ساختہ افغانستان سے مفرور مہاجرین کو صوبہ بلوچستان کے سرحدی علاقوں پشین، چمن، پنجپائی، لورالائی، ژوب اور چاغی سے دور رکھا جائے۔ بلکہ انہیں واپس افغانستان بھیج دیا جائے کیونکہ ان کی وجہ سے مقامی آبادی کو اپنی ضروریات زندگی کے حصول میں مختلف مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ اور ضروری اشیا آٹا، چینی، گھی اور تیل وغیرہ کی قیمتوں میں اضافہ ہوگیا ہے ۔ چوری اور چور بازاری میں اضافہ ہوگیا ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ مفرور خود ساختہ مہاجرین کی آمد کو بند کیا جائے اور آمدہ مہاجرین کو واپس بھیج دیا جائے تاکہ پاکستان اور افغانستان کے دوستانہ تعلقات میں زیادہ کشیدگی نہ پیدا ہوجائے بلوچستان کے جید نامور قبیلہ بگٹی کے رہنما اور بلوچستان کے سابق گورنر نواب محمد اکبر خان بگٹی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ افغانستان کے عوامی انقلاب افغانستان اور اس کے عوام کا اندرونی معاملہ اور صدر نورمحمد ترہ کی کو 95 فیصد عوام کی حمایت حاصل ہے۔اس انقلاب کی رجعت پسند ملّا جاگیردار اور سرمایہ دار مخالفت کررہے ہیں۔''

15 ستمبر 1979ء کو بابو نے یہ خبر شائع کی ہے؛

''آج یہاں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے این ڈی پی بلوچستان کے جنرل سیکرٹری غلام دستگیر خان، پی ایس ایف کے سابق اور این ڈی پی کی مجلس عاملہ کے رکن بسم اللہ خان، ملک عبدالعلی کاکڑ، نوابزادہ سرفراز خان جوگیزئی، سید غلام رسول ذکریا، تورآغا، ملک غلام مہر رسول اور یار محمد کاکڑ کی پاکستان نیشنل پارٹی میں شمولیت کا اعلان کیا۔

''کریم امن ہزار گنجی بلوچستان نے نیک تمناؤں کے ساتھ سیکولر اور ترقی پسند جمہوری اور سیاسی اہلیانِ بلوچستان سے اپیل کی ہے کہ وہ پاکستان اور خصوصاً بلوچستان میں بلوچ پشتون اتحاد اور فلاح و بہبود کے پیشِ نظر زیادہ سے زیادہ تعداد میں پی این پی میں شامل ہوکر جمہوری اور سیاسی

مفادات کیلئے جدوجہد کریں۔''

انہوں نے 8 جنوری 1980ء کو یہ کارڈ جاری کیا تھا؛

''کریم امن ہزار گنجی بلوچستان نے نیک تمناؤں کے ساتھ نئے صدر انقلابی کونسل کے اراکین اور کابینہ کے وزیروں کو مبارکباد دیتے ہوئے دعا کی کہ انہیں 27 اپریل 1978ء کے انقلابِ ثور کو شہید صدر اور وزیراعظم جناب نور محمد ترہ کی تعلیمات اور نقش قدم پر آگے بڑھانے کیلئے اپنے ہمسایہ اقوام اور ممالک خصوصاً سوویت یونین، پاکستان، ایران، چین اور بھارت اور عموماً ایشیائی ممالک جاپان، کوریا، ویت نام، کمپوچیا، لاؤس، انڈونیشیا، ملائشیا، برما، سری لنکا اور مشرق وسطیٰ، افریقہ، یورپین ممالک' کیوبا، امریکہ، لاطینی امریکہ اور آسٹریلیا کی تمام اقوام اور ممالک کے ساتھ امن اور صلح و آشتی سے باہمی دوستانہ روابط کو کامرانی نصیب ہو۔''

1982ء میں ضیا مارشل لا میں انہیں ایک ہینڈ بل چھاپنے پر گرفتار کر لیا گیا۔

بابو عبدالکریم امن' صحافت کے علاوہ ادب کی دنیا میں بھی موجود رہتے۔ وہ شاعری کرتے تھے۔ ان کی شاعری واقعاتی اور زندگی کے گرد گھومتی تھی۔ وہ مقصدیت والی شاعری کرتے تھے۔

بھلا پورے اس خطے میں دوسرا کون ہے جس نے امن کے پیامبر برٹرنڈ رسل کی وفات (2 فروری 1970ء پر) شاعری کی ہو۔ بابو امن ہی تھے؛

ایمنی دوستیں یل و سنگتاں
گوں رنجیں دل ءَ بشکنت گشتناں
امن دوست و دل واہ برٹرنڈر سل
کہ بیران بوتگ مڑاہ دار یل
بل رسل ءِ آ ایمنی ءِ چراغ
مدام روژ نامں دنیا ءِ باغ

بلوچی کا شاعر آزادی کے مورچہ کا تلوار بردار سپاہی، قوم و وطن کا بہادر عبدالکریم شورش۔ انہوں نے اپنی زبان و ادب کی زبردست خدمت کی۔ ان کے شعر بھی شور سے بھرپور ہیں۔ ان کی شاعری میں عشق کا حصہ ضعیف ہے مگر قومی شعر اس قدر قوت رکھتے ہیں کہ پڑھتے وقت انسان کے

رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

بابو کو ہم نے کیا مقام دیا' اُن کی توقیر ہم نے کس طرح کی، یہ بات ہم اُس اقتباس سے آپ کو بتاتے ہیں جو ہم نے فضل احمد غازی کے ایک مضمون سے لیا ہے؛

فضل احمد غازی سے بابو کی ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے کہ؛'' غازی بھائی! جن کے اقتدار کا محل ہم غریب کارکنوں کی محنت، قربانی اور قید و بند کی بنیاد پر تعمیر ہوا ہے، ان سے بہت تنگ آ چکا ہوں۔ مجھے پاگل کا خطاب انہی لوگوں نے دیا ہے جن کے لئے میں نے بلوچستان کے کوہ و بیابان میں، ایک طویل عرصے تک زندہ باد کے نعرے لگائے تھے۔ تم نے اچھا کیا، کہ ان برخود غلط لوگوں کی صف سے نکل کر گوشہ نشینی اختیار کی اور ادبی کام میں مصروف ہو گئے ہو۔''(10)

حوالہ جات

1- نوائے وطن۔ 9 جون 1975، صفحہ نمبر 5

2۔ ایضاً

3۔ نوائے وطن۔ جولائی 1975۔ سرداری نظام تازہ ہو رہا ہے۔ صفحہ نمبر 5,6

4۔ ایضاً

5۔ ملک محمد پناہ'' ریلوے کی توسیع''۔ نوائے وطن کوئٹہ۔ 9 اگست 1975۔ صفحہ 3

6۔ ہفت روزہ عوامی جمہوریت لاہور۔ 9 ستمبر 1975 صفحہ نمبر 2

7۔ ہفت روزہ عوامی جمہوریت لاہور۔ 9 ستمبر 1975 صفحہ نمبر 3

37۔ عوامی جمہوریت لاہور'' گرتو برانہ مانے'' جنوری 1976 صفحہ 4

8۔ عوامی جمہوریت لاہور'' جمہوریت کی بحالی'' 9 جنوری 1976ء، صفحہ نمبر 1

9۔ ملک محمد پناہ' لغاری صاحب کے ارادت مندوں کے لئے'' نوائے وطن کوئٹہ 9 مارچ 1976ء صفحہ نمبر 65

10۔ غازی، فضل احمد۔ عبدالکریم شورش ایک تحریک............صفحہ 25

بابو شہید ہوئے

تمام حوصلہ شکنیوں کے باوجود، زمانے کی تمام مخالف ہواؤں کے باوجود بابو کے پائے استقامت میں ذرا برابر بھی لرزش نہ آئی اور وہ تنہا نوکیں دور کے چھوٹے چھوٹے کارڈ یا پرچیاں چھاپ کر منزلِ مقصود کی جانب رواں تھے۔ وہ تمام عمر معاشی اور ذہنی پریشانیوں کا شکار رہے۔ لیکن بلوچستان کے گیت گا کر ہمیشہ مایوسی کو امید سے شکست دیتے رہے۔ اُن کی پریشانیوں اور بے سروسامانیوں کا ساتھی چلتن ہزار گنجی تھا جہاں جا کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے تھے۔ اُن مسلم لیگی بورژوا قوتوں نے اُن کو جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی جو بلوچستان کی دولت غیر ملکیوں کے ہاتھ بیچ کر محلوں کے مالک بنے تھے اور اپنی تمام تر خیرخواہی بلوچوں اور بلوچستان میں گردانتے تھے۔

وہ اس دکھ بھری دنیا کے عظیم فرزند، ایک ایسی مسرور شخصیت نظر آتے تھے جس نے مقصود کی خاطر اپنی ہستی کو دشمنی کی بھینٹ بھی چڑھا دیا۔ وہ ذاتی فکر کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ اُن کی فکر کا رخ تو قطب نما کی سوئی کی طرح ہمیشہ بلوچستان اور بلوچوں کے فلاحی مفادات کی طرف رہتا تھا۔ جس کے لئے اُن کی شاعری اور تحریریں بطور ثبوت موجود ہیں۔ انہوں نے تو ساری عمر اپنے حال پر ایک آنسو بھی نہ بہایا لیکن بلوچستان اور اہل بلوچستان کے لئے ہمیشہ اشک بار رہتے اور ہمیشہ بلوچوں کی نااتفاقی پر نوحہ خوانی کرتے رہے۔ انہوں نے خود اپنے خوابوں کو پلکوں پر سجائے ساری

عمر درد و کرب میں گزار دی۔ تو پھر لوگوں نے ان کے افکار اور کارناموں کو کیوں نہ سمجھا، اُن کی بات کیوں نہ سُنی۔ اُن کا یہ کارنامہ اور فکر لوگوں کو کیوں عجوبہ لگتی تھی اور وہ کیوں اُن کو مزاح کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں جب بابو عہدِ شباب میں تھے، تب وہ ایک ایسے سامراج دشمن انقلابی نوجوان تھے کہ انگریزی استعمار اور کالونیل ازم کے خلاف جس بھی جماعت کی جانب سے مظاہرہ یا جلسہ ہوتا وہ پورے جوش و خروش سے اس میں حصہ لے کر اپنا کردار ادا کرتے۔

بابو اگر ابن الوقت ہوتے تو وہ بھی بلوچستان کے مول لگا کر انگریزوں اور وقت کے حاکموں کی وفاداری کے تمغے اور القاب اپنے سینے پر سجا سکتے تھے۔ بڑی بڑی جاگیریں لے کر اپنے بچوں کے ساتھ پُرسکون اور پرآسائش زندگی گزار سکتے تھے۔ جھوٹ دھوکہ اور ملاوٹ سے سرمایہ کما سکتے تھے۔ مگر انہوں نے نیک اور صالح مشن کی خاطر جھوٹی شان وشوکت اور ان ساری وقتی 'نعمتوں' کو ٹھکرا دیا۔ لوگوں نے اُن کو دکھ بھی دیے۔ مگر ان کے قلم نے کسی کو کوئی دکھ نہ دیا، بددعا نہ کی۔ ان پر جسمانی اور روحانی حملے بھی کثرت سے ہوئے مگر عزم واستقلال کی دولت سے مالا مال، ہر بار وہ چٹان کی طرح اپنے ارادہ پر قائم رہے۔

ان کا خیابان صرف سات آٹھ پھولوں پر ہی مشتمل نہ تھا بلکہ پورا بلوچستان ہی اُن کی پھلواری تھی۔ اس میں کھِلے ہوئے ہزاروں، لاکھوں پھولوں سے انہیں محبت تھی۔ جن کی آبیاری کے لئے انہوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی۔

یہ وہی شورش صاحب تھے، جو کمسنی ہی میں روشن فکر خیالات کے مالک بنے اور 1925-26ء سے اپنے ان خیالات سے بلوچستان کے عوام اور محنت کشوں کے سینے منور کیے۔ وہ بلوچستان میں قومی تحریک کی بنیاد رکھنے والے اولین رہنماؤں میں سے تھے جنھوں نے انگریزوں کی ''غلام منڈی'' کی فہرست سے اپنے وطن کا نام مٹانے کے لئے بے لوث جدوجہد کی۔

بابو بلوچستان مزدور پارٹی کے اولین رہنماؤں میں سے تھے۔ انہوں نے یہاں کے کوئلہ کان مزدوروں اور ریلوے کے محنت کشوں کو ان کی اہمیت کا احساس دلایا اور بلوچستان میں پہلی

کامیاب ہڑتال کروائی۔

انہوں نے ایک پمفلٹ کے ذریعے انگریزوں کے خلاف شورش برپا کی۔انہوں نے اپنے جریدہ ''نوکیں دور'' کے ذریعے بلوچی زبان کو چاند پر متعارف کرایا۔انہوں نے بلوچستان کا کھویا ہوا وقار دلانے میں ون یونٹ کو توڑنے کے لئے خوب جدوجہد کی اوراس میں کامیاب بھی ہوئے۔

بابوجو بلوچستان میں مینارِ امن قائم کرکے اس کو دارالامن بنانا چاہتے تھے۔ لیکن،بلوچستان میں ان کی شخصیت کو کسی نے قبول نہ کیا۔وہ سیاسی ،ادبی ،قومی اورلسانی بنیادوں پر مخالفت کا نشانہ بنتے رہے۔لوگوں نے بلوچستان کے اِس محسن سے بے وفائی کی جس نے نوکیں دور کے مشعل سے تادم مرگ بلوچستان کو روشن رکھا۔اہل بلوچستان کو روشن راہیں دکھائیں۔کوہِ چلتن سے نوکیں دور کی اذانیں دیں۔

پھر 14 دسمبر 1986ء کو صبح سات بجے اس بڑے صحافی اور بلوچستان میں سیاست کی روشنی کے اس منبع کو موت نے نگل لیا۔اور وہ نہایت خاموشی سے سول ہسپتال کوئٹہ میں مرگیا۔ان کی عمر 70 برس تھی۔

انہیں ان کی وصیت کے مطابق چلتن کے دامن میں سڑک کے کنارے دفن کردیا گیا۔

یہ بطلِ جلیل یورپ اور کوریا کو ملانے والی عظیم شاہراہ کے کنارے ہزار گنجی میں محوِ خواب ہے۔

From London to China and Korea

Upon this highway lies my Borea

Find me in the green wood of the chiltan

& Hazarganji, heart of Balochistan

ہزار گنجی میں کچی قبر اور اُس کا پس منظر

سارا شہر محوِخواب تھا۔30اور 31 مئی 1935ء کی درمیانی شب تھی۔3 بجکر 3 منٹ پر اچانک ایک خوفناک گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی جانوروں کی چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔پھر چند لمحوں کے لئے بالکل خاموشی چھا گئی۔ایسی خاموشی جیسے سارے شہر کو سانپ سونگھ گیا ہو۔کچھ ہی لمحوں بعد بچاؤ......بچاؤ......جیسی انسانی چیخوں سے پوری وادی گونجنے لگی۔اُس زلزلے نے پہلے ہی وار میں پورے شہر کو ملیامیٹ کرکے ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل کردیا۔ایک ہنستے بستے خوبصورت شہر(لٹل لندن) کو اجاڑ کے رکھ دیا۔انگریزی طرز کی خوبصورت عمارتیں منہدم ہوگئیں۔کیسی خون آلود رات تھی۔اس خونیں رات نے نہ صرف کوئٹہ میں بلکہ 90 میل قلات تک کے علاقے میں ساٹھ ہزار سے زیادہ انسانوں کو لقمہ اجل بنایا۔بلکہ کئی شہروں اورسیکڑوں دیہاتوں کو پیوند زمین کردیا۔اُس ظالم کو نہ باپ نظر آیا نہ ماں نظر آئی،نہ بہن،نہ بھائی۔۔۔۔سب کو اجتماعی قبروں میں دفن کردیا۔کچھ رضا کار دستے لاشوں کو ملبے تلے سے نکال رہے تھے تو کچھ اُن کو دفنانے میں لگے ہوئے تھے۔موت کے منہ سے بچ نکلنے والے محفوظ مقامات کی تلاش میں سرگرداں تھے۔

اسی عالم میں مستونگ سے آیا ہوا تئیس سالہ نوجوان عبدالکریم موت کے منہ سے بچتا بچاتا پیدل ہی مستونگ کی جانب روانہ ہوا۔کوئٹہ سے تقریباً3-4 میل کے فاصلے پر ہزار گنجی کے

مقام پر جب پہنچا تو دل میں یہ خیال سرایت کر گیا کہ موت برحق ہے۔ اگر آج میں موت سے بچتا بچاتا یہاں تک پہنچ گیا ہوں تو کل نہ جانے کس حال میں اور کہاں موت کا اجل مجھے اپنا مہمان بنائے۔ رفتہ رفتہ اس مقام سے اُن کا تعلق بڑھتا گیا اور وہ مقام ان کے دِل و دماغ پر اِس طرح نقش ہو گیا کہ اسے انہوں نے اپنا جائے مدفن انتخاب کیا۔ کوئٹہ اور مستونگ آتے جاتے وہ جب بھی اس مقام پر پہنچتے تو اُس قیامت خیز زلزلہ کی نقش شدہ خون آشامی اُن کے ذہن میں گردش کرتی اور ایک لاشعوری کی کیفیت سوچنے پر مجبور کرتی۔

پھر 20 مئی 1965ء کے ایک اور حادثے نے ان کے 1935ء والے زخم تازہ کئے۔

وہ ہے پی آئی اے بوئنگ کا المناک حادثہ جس میں 127 مسافر سوار تھے اور جن میں سے صرف چار مسافر زندہ بچ گئے تھے۔ اس المناک حادثے میں بیسیوں ممتاز صحافی بھی جاں بحق ہوئے تھے۔

اب چونکہ وہ خود بھی ایک صحافی تھے اور اپنا بلوچی ہفت روزہ ''نوکیں دور'' شائع کر رہے تھے جس کا اجرا انہوں نے جون 1962ء میں کیا تھا۔ اس حادثہ نے اُن کے دل و دماغ پر بارِ دیگر کا کام انجام دیا اور جو ایک تحریری وصیت نامہ کی صورت میں نوکیں دور میں شائع ہوا۔ انہوں نے اپنے دوستوں، احباب اور عزیزانِ قوم سے گزارش کی کہ ایک صحافی کی موت کسی بھی مقام، جگہ اور سفر میں لاحق ہو سکتی ہے۔ اگر میں کہیں بھی موت سے ہم آغوش ہو جاؤں تو میرے جسدِ خاکی کو اسی مقام چلتن کے پہاڑ کے دامن ہزار گنجی میں چار پانچ قبروں کے پہلو میں دفن کیا جائے۔ تاکہ گزرنے والوں کے دلوں میں میری انسانیت' ملک وقوم کی فلاح و بہبود اور تعمیر و ترقی اور بلوچی زبان و ادب اور ثقافت کی نشوونما کیلئے سماجی اور صحافیانہ مخلصانہ خدمات اور جدوجہد کی یاد تازہ رہا کرے۔

یوں اپنی زندگی ہی میں انہوں نے اپنی ابدی زندگی کا رشتہ کوہِ چلتن ہزار گنجی سے جوڑ لیا۔

یعنی شورش اور ہزار گنجی لازم و ملزوم ہو گئے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی جائے انتخاب مدفن پر اپنے جریدہ نوکیں دور کے بورڈ نصب کرنا شروع کر دیے جو چوری ہوئے یا کروائے گئے۔ بورڈوں کے چوری ہونے کا سلسلہ کئی سالوں تک جاری رہا۔ چور چوری سے باز نہیں آتے تھے اور شورش صاحب بورڈوں کی تنصیب سے۔ ان بورڈوں پر اپنے جریدہ نوکیں دور کا نام اپنی سوچ، فکر اور نظریہ کو شعوری

صورت میں تین زبانوں بلوچی، پشتو اور انگریزی میں خوبصورت انداز سے لکھواتے۔ جس میں بلوچستان سے محبت' انسان سے محبت امن و آشتی اور نیک خواہشات کا مجموعہ اظہار ہوتا تھا۔

جب تک وہ زندہ تھے ہفتہ میں ایک بار ہزار گنجی کا چکر ضرور لگاتے اور اکثر کیمرہ گلے میں لٹکائے اپنے دوستوں اور احباب کو لے جاتے، اپنے ساتھ اُن کی تصویریں بناتے اور اُن کو اپنی جائے انتخاب مدفن دکھاتے اور اپنی اہم خواہش سے آگاہ کرتے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جہاں سب لوگ تو اپنے محلوں کی تعمیر میں لگے ہوں۔ مگر یہ شخص اپنی قبر کی تعمیر میں۔ مگر آج وہ خود ہزار گنجی کے گورِ غریباں میں عالم محویت میں پڑا ہوا ہے اور ان کی قبر پر کوئی دیا جلانے والا نہیں۔

لیکن پھر صد آفرین ہے کہ کوہِ چلتن کی وفا کو۔ جس نے اپنے عاشق کو اپنے دامن میں جگہ دے کر اُس کی قبر کو اپنے خوبصورت رنگ برنگے پتھروں سے سجایا تو ہے۔

اُنکی وصیت، آخری خواہش اور کچی قبر۔

اہلِ بلوچستان کے لئے ایک سوالیہ نشان بن کر راہ تک رہی ہے کہ کب ہاتھ بڑھیں اور مرقد شایانِ شان بنائیں۔

یہ قبر بہرحال اب پکی ہو چکی ہے، مگر ہم نے اس کے گرد جو پکی چاری دیواری تعمیر کروائی تھی وہ زور آور زمین والوں نے دیدہ دلیری سے گرادی۔

عقیدت کا ایک پھول

بدستِ

میر غوث بخش بزنجو

میں عبدالکریم شورش کو 1939ء سے جانتا ہوں، جب 1939ء میں مستونگ میں نیشنل پارٹی کا اجلاس ہورہا تھا۔ میں کراچی سے بلوچ لیگ کراچی کے نمائندہ کی حیثیت سے گیا اور اس میں شامل ہوا۔ ہمارا یہ کارواں کوئٹہ سے مستونگ کی طرف روانہ ہوا۔ شورش بابو اس میں شامل تھے۔ شورش بابو بہت محنتی اور بہادر نوجوان ورکر تھے۔ اس وقت بھی شورش بابو اپنے نظریات میں ایک ترقی پسند انسان تھے۔ شورش بابو اپنی ترقی پسندی میں اتنے آگے گئے تھے کہ وہ اپنی فکر کے خلاف کوئی ایسی بات بھی برداشت نہ کرتے تھے جس میں رجعت پسندی کا شبہ تک ہوتا۔ ہمارے ساتھیوں میں سے سب سے زیادہ محنت کرنے والے شورش بابو تھے جو عوامی انداز میں اپنے لوگوں کے پاس جا کر کام کرتے۔

جس وقت ہمارا جلسہ ہورہا تھا انگریز، خانِ قلات اور سرداروں نے سازش کی۔ وہ ایک بڑا لشکر لے کر آئے جو کہ خوب مسلح تھا۔ وہ جلسہ کو منتشر کرنا چاہتے تھے۔ ان کا یہ مقصد پورا نہ ہوا اس لئے کہ جلسہ کے اندر موجود لوگوں کے پاس بھی کافی اسلحہ تھا۔ اس لئے حکومت کو خوف ہوا کہ اگر

یہاں لڑائی ہوئی تو بہت کشت و خون ہوگا۔ اس لئے انہوں نے اپنے لوگوں کو جنہیں انہوں نے قبائلی نام سے بھیج دیا تھا، روک لیا۔ حکومت نے نیشنل پارٹی کے جلسہ پر پابندی لگا دی اور ہمیں جلسہ کرنے نہ دیا۔ اس تمام دوران اور اس کے بعد جب ہمیں جلاوطن کیا گیا تو شورش بابو بھی جلاوطن کئے گئے۔ جلاوطنی کا زمانہ بڑی مشکلات کا زمانہ تھا اور شورش کی اپنی ایک انفرادیت تھی۔ انہیں ہمیشہ اپنی قوم، ملک اور وطن کی خدمت اور ترقی کی فکر رہتی تھی۔

بعد میں شورش بابو نے ایک اخبار نکالا اور اس کے وسیلے سے جو کچھ ان سے بن پڑا انہوں نے ہر طرح سے اس میں لوگوں کو بلوچستان کے حالات پہنچائے۔ آخری زمانے میں شورش بابو مفلس ہوئے مگر یہ ساری کمزوری اور بیماری اور بے بسی میں بھی شورش بابو کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ اور اپنی موت تک قومی خدمت کی سرگرمیوں میں لگے رہے۔ شورش بابو کو ہمیشہ غریبی، بھوک اور بے سروسامانی کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ مستونگ سے نکلے اور کوئٹہ آ کر بس گئے۔ انہیں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ انہوں نے یہ دن بھی اپنے خاندان کے ساتھ کسی نہ کسی طور جھیل لئے۔

میں خود شورش بابو کی زندگی کو اپنے ساتھیوں کے لئے ایک نمونہ سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں شورش جیسے دکھ برداشت کرنے اور سخت جان ساتھی بہت کم ملیں گے۔ میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ میں بلوچستان کے لئے ان کی خدمات کا قدردان ہوں اور ہمیشہ ان کا احترام کرتا رہوں گا۔